علامہ اقبال

اور

رد مرزائیت

عقیدہ ختم نبوت اور فکر اقبال

پروفیسر محمد الیاس اعظمی (لاہور)

مفکر اسلام حضرت علامہ ڈاکٹر محمد اقبال (متوفی ۱۹۳۸ء) برصغیر کی وہ عبقری اور نادر روزگار شخصیت تھے کہ جن کو عین حیات اور بعد از مرگ بھی فکر اسلامی کی تشکیل اور تعین میں ایک اہم مقام حاصل رہا ہے۔ بالخصوص برصغیر پاک و ہند میں اُمت مسلمہ کے ملی تشخص اور فکری نظریہ حیات کے احیاء میں جو کردار تنہا حضرت اقبال نے ادا کیا ہے وہ دیگر طبقات حیات میں سے ایک فرد یا ایک جماعت مل کر بھی عشر عشیر ادا نہیں کر سکے۔

اقبال کو حضور ایزدی سے فکری قیادت کا وہ اعلیٰ وارفع مقام عطا کیا گیا تھا کہ ہمارے برصغیر کی تاریخ میں کوئی بڑے سے بڑا عالم، مفکر اور دانشور اس مقام کو چھو بھی نہیں سکتا۔ دیگر بہت سی وجوہات کے علاوہ اسکی ایک بڑی وجہ اقبال کا بیک وقت اسلامی اور غیر اسلامی فلسفہ حیات کا گہرا اور ناقدانہ مطالعہ تھا۔ اقبال نے فلسفہ جدید (مغربی فلسفہ) کو قریب سے ہو کر دیکھا اور پڑھا تھا۔ اسکی خوبیاں، خامیاں سب پر عیاں تھیں۔ ایک مسلم مفکر ہونے کی حیثیت سے فلسفہ اسلام کا ایک ایک پہلو ان کی نگاہ میں تھا۔ فلسفہ قدیم و جدید کے گہرے مطالعے کیساتھ ساتھ انہوں نے مسلم و غیر مسلم تاریخ کا انتہائی گہرا مطالعہ بھی کر رکھا تھا۔ چنانچہ تاریخ کے اس مطالعہ نے بھی اسکی فکر رسا کی راہیں متعین کرنے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔

بیسویں صدی کے ربع اول کی پہلی دو دہائیوں پر مشتمل برصغیر کی مسلم اعتقادی، سیاسی و تہذیبی اور فکری زندگی پر ایک طائرانہ نظر ڈالنے سے ایک عام شخص بھی ان پر فکر اقبال کے اثرات نمایاں دیکھنے لگتا ہے۔ اقبال کی فکر راست کا یہی پہلو تھا جس نے اسے بالخصوص مسلمانوں اور بالعموم ہندوستان سے تعلق رکھنے والی تمام اقوام و افراد کی نگاہ میں معتبر بنا دیا اور زندگی کے ہر پہلو سے متعلق انکی رائے کو عزت اور قبولیت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔

علامہ اقبال نے فکر اسلامی کے ارتقاء کے حوالے سے مسلم معاشرے میں مختلف ادوار اور مراحل کے موقع پر پیدا ہونے والے مسلم فرقوں اور گروہوں انکی تاریخ انکے فکر و فلسفہ اور ان کے وجود میں آنے کے تاریخی، سیاسی، تہذیبی، تمدنی، علمی، فکری اور نظریاتی وجوہ و اسباب کا کھوج لگایا اور گہرے تجزیے اور مشاہدے کے بعد انکے مسلم معاشرے پر مرتب ہونے والے اثرات کا جائزہ بھی لیا تھا جس کے باعث وحدت ملی پارہ پارہ ہو چکی تھی۔ اقبال جو دراصل ملت اسلامیہ کی چشم بینا کی حیثیت رکھتے تھے اس لیے وہ مسلمانوں کے اندر اٹھنے والی ہر نئی تحریک اور پیدا ہونے والی نئی

جماعت کے عقائد ونظریات، فکر و فلسفہ، قیادت اور اسکے طریقہ کار پر نہ صرف نگاہ رکھتے تھے بلکہ اسکا ناقدانہ جائزہ لیکر اپنا ماہرانہ تبصرہ بھی کیا کرتے تھے۔

قادیانیت جس نے انیسویں صدی کے آخری سالوں میں برطانوی گورنمنٹ کی گود میں جنم لیا تھا اور اپنی پیدائش کے بعد تھوڑی مدت میں ہی یہ برصغیر پاک و ہند کا سب سے بڑا نظری فتنہ بن گیا تھا۔اس فتنہ نے ابتداء میں جب بڑے بڑے اہل علم کو متاثر کیا اور عوام کا تو کیا کہنا جو اس طرف مائل ہوتے جارہے تھے۔اس فتنہ کے بانی نے اپنی دعوت کو قرآن کی دعوت بنا کر پیش کیا تھا اور کہا کرتا تھا۔

جمال وحسن قرآن نور جاں ہر مسلماں ہے
قمر ہے چاند اوروں کا ہمارا چاند قرآں ہے

(براہین احمدیہ حصہ اول ص ۱۹۸)

چنانچہ حضرت اقبال نے اس تحریک کے بالکل ابتدائی دنوں میں اس کو ٹھیٹھ اسلام کا نمونہ قرار دیا تھا (یادرہے کہ یہ اس زمانے کی بات ہے جب مرزا کے کفر اور گمراہی پرمبنی دعاوی منظر عام پر نہیں آئے تھے۔الیاس) مگر جب مرزا کا کفر طشت ازبام ہوگیا تو دیگر مسلم رہنماؤں کی طرح حضرت اقبال نے بھی قادیانیت کو اسلام دشمن اور نبوت محمدیہ سے بغاوت اور قوم و ملت کا داغدار اور اس کے خلاف ایک سازش قرار دیا۔یوں اقبال نے ملت اسلامیہ کے وجود میں پیدا ہوجانے والے اس ناسور اور اسکی مضرت رسانیوں کا بروقت اظہار کر کے اعتقادیات کے باب میں ایک تاریخی کارنامہ سرانجام دیا ہے۔اقبال کی اس فکری رہنمائی سے بالخصوص جدید تعلیم یافتہ طبقہ کے ذہنوں میں قادیانیوں کے پیدا کردہ شکوک وشبہات کا نہ صرف ازالہ ہوگیا بلکہ انکا دین وایمان بھی ختم نبوت پر پختہ اعتقاد کے حصار میں آ کر محفوظ ہوگیا۔

[redacted]:

حضرت اقبال اپنے مشہور خطبات میں دین اسلام میں ختم نبوت کی حقیقت اسکی ضرورت واہمیت کو واضح کرتے ہوئے فرماتے ہیں!

> [[اسلام کا ظہور استقرائی فکر (INDUCTIVE INTELLECT) کا ظہور ہے۔اس میں نبوت اپنی تکمیل کو پہنچ گئی اور اس تکمیل سے اس نے خود اپنی خاتمیت کی ضرورت کو بے نقاب دیکھ لیا۔اس میں یہ لطیف نکتہ پنہاں ہے کہ زندگی کو ہمیشہ کیلئے عہد طفولیت کی حالت میں نہیں رکھا جاسکتا۔اسلام نے مذہبی پیشوائیت اور وراثتی بادشاہت کا خاتمہ کر دیا۔قرآن مجید غور وفکر اور تجربات ومشاہدات پر بار بار زور دیتا ہے اور تاریخ

فطرت دونوں کو علم انسانی کے ذرائع ٹھہراتا ہے۔ یہ سب اسی مقصد کے مختلف گوشے ہیں جو ختم نبوت کی تہ میں پوشیدہ ہیں۔ پھر عقیدہ ختم نبوت کی ایک بڑی اہمیت یہ بھی ہے کہ اب نوع انسانی کی تاریخ میں کوئی شخص اس امر کا مدعی نہیں ہو سکتا کہ وہ کسی مافوق الفطرت اختیار (Super Natural Authority) کی بنا پر دوسروں کو اپنی اطاعت پر مجبور کر سکتا ہے۔ ختم نبوت کا عقیدہ ایک ایسی نفسیاتی قوت ہے جو اس قسم کے دعویٰ اقتدار کا خاتمہ کر دیتی ہے]]۔ (تشکیل جدید الٰہیات ص۱۹۳، بزم اقبال ۱۹۵۰ء)

پنڈت جواہر لال نہرو نے کلکتہ سے نکلنے والے ''ماڈرن ریویو'' میں قادیانیت کے دفاع میں سلسلہ وار تین مقالات لکھے تو قادیانی کے ہندو وکیل کی طرف سے پھیلائی جانے والی غلط فہمیوں کو دور کرنے اور شکوک و شبہات کا ازالہ کرنے کیلیے حضرت اقبال نے ''سونار کی ایک لوہار کی'' ضرب المثل کے مطابق ''اسلام اور احمدیت'' کے عنوان سے ایسا معرکۃ الآراء مقالہ لکھا کہ وکیل اور موکل دونوں منہ تکتے رہ گئے۔ حضرت علامہ کے اس مقالہ کا جواب جواہر لال نہرو تو کیا دیتے خود قادیانی فضلاء بھی اقبال کے اٹھائے ہوئے علمی نکات اور فکری و نظریاتی واضح سوالات کے جواب دینے سے قاصر رہے۔

[redacted]:

حضرت علامہ نے ۲۱ جون ۱۹۳۶ء میں جواہر لال نہرو کے نام ایک نجی خط میں قادیانیت سے متعلق اپنے جذبات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا!

[[میرے ذہن میں اس سے متعلق کوئی ابہام نہیں کہ احمدی اسلام اور ہندوستان دونوں کے غدار ہیں]]۔ (تحریک ختم نبوت از شورش کاشمیری ص۹۰)

[redacted]:

اس دور کے اقبال کے اخباری بیانات اور خطابات و پیغامات کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال احوالے سے کس اضطراب کا شکار تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے ایک بیان میں اپنی اس خواہش کا اظہار کیا تھا کہ!

[[قادیانیوں اور جمہور مسلمانوں کی نزاع نے جو مسئلہ پیدا کیا ہے وہ نہایت اہم ہے اور ہندوستان نے اس کی اہمیت کو حال ہی میں محسوس کرنا شروع کیا ہے۔ میرا ارادہ تھا کہ ایک کھلی چٹھی کے ذریعہ انگریز قوم کو اس مسئلہ کی معاشرتی اور سیاسی الجھنوں سے آگاہ کروں لیکن افسوس کہ میری صحت نے ساتھ نہ دیا]]۔ (تحریک ختم نبوت ص۹۸)

[redacted]:

علامہ اقبال بنیادی طور پر ایک فلسفی تھے اس لیے وہ معاملہ کی تہہ تک جا کر اس کے علل واسباب کا کھوج لگاتے تھے اور پھر اس سے ایسا منطقی نتیجہ نکالتے تھے کہ جس کا انکار کرنا یا اس کو جھٹلانا آسان نہیں ہوتا تھا چنانچہ دین اسلام میں نبوت محمدی علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے مقابلہ میں کسی نئی نبوت سے پیدا ہونے والے نتائج اور ان کے عواقب کو بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں!

[[اسلام دینی حیثیت سے ان تمام مذاہب سے زیادہ گہرا ہے جو جزوی طور پر مذہب اور جزوی طور پر نسل سے تشکیل پاتے ہیں۔ اسلام نسلی تخیل وتصور کی کا ملا نفی کرتا اور اپنی اساس قطعا دینی اعتقاد پر رکھتا ہے چونکہ اسکی اساس ہی دینی ہے جو سرتاپا روحانیت ہے۔ اس لیے خونی رشتوں سے کہیں زیادہ لطیف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان ایسی تمام تحریکوں کے بارے میں بہت زیادہ حساس ہیں جنہیں وہ اپنی اساسی وحدت کے لیے خطرناک سمجھتے ہیں ۔ چنانچہ ہر ایسی مذہبی جماعت جو تاریخی طور پر اسلام سے وابستہ ہے لیکن اپنی بنیاد کسی نئی نبوت پر رکھتی ہے اور ان تمام مسلمانوں کو کافر قرار دیتی ہے جو اس کے مبینہ الہامات پر اعتقاد نہیں رکھتے۔ مسلمان اس جماعت کو اسلام کی وحدت کیلیے ایک خطرہ تصور کرتے ہیں اور ایسا ہونا بھی چاہیے کیونکہ وحدت اسلامی کا تحفظ ختم نبوت کے عقیدہ ہی سے ممکن ہے]]۔ (تحریک ختم نبوت ص ۹۸)

چنانچہ وحدت اسلامی کے اسی تصور کو اپنے اشعار کی صورت میں یوں پیش کرتے ہوئے اپنی مشہور نظم "ہندی اسلام" میں لکھتے ہیں!

ہے زندہ فقط وحدت افکار سے ملت\
وحدت ہو فنا جس سے وہ الہام بھی الحاد\
وحدت کی حفاظت نہیں بے قوت بازو\
آتی نہیں کچھ کام یہاں عقل خداداد\
مُلا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت\
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

[redacted]:

۱۰ جون ۱۹۳۵ء کو اخبار اسٹیٹسمین کے ایڈیٹر کے نام ایک خط میں دین اسلام کی اعتقادی حدود کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں!

[[اسلام لازماً ایک دینی جماعت ہے جس کے حدود مقرر ہیں یعنی وحدت والوہیت پر ایمان، انبیاء پر ایمان اور رسول کریم ﷺ کی ختم رسالت پر ایمان دراصل یہ آخری یقین ہی وہ حقیقت ہے جو مسلم اور غیر مسلم کے درمیان وجہ امتیاز ہے اور اس امر کیلئے فیصلہ کن ہے کہ فرد یا گروہ ملت اسلامیہ میں شامل ہے یا نہیں؟ مثلاً برہمو خدا پر یقین رکھتے ہیں اور رسول کریم کو خدا کا پیغمبر مانتے ہیں لیکن انہیں ملت اسلامیہ میں شمار نہیں کیا جاسکتا کیونکہ قادیانیوں کی طرح وہ انبیاء کے ذریعہ وحی کے تسلسل پر ایمان رکھتے ہیں اور رسول کریم ﷺ کی ختم نبوت کو نہیں مانتے]]۔(حرف اقبال ص ۱۱۷ مرتبہ لطیف احمد شیرانی)

عقیدہ ختم نبوت کی یہی وہ دینی و مذہبی، سیاسی و سماجی اور روحانی و اعتقادی اہمیت ہے جس کے باعث اقبال جیسا دانشور جہاں بھی یہ خطرہ محسوس کرتا ہے کہ مسلمانوں کے اس تشخص اور اسلام کے امتیازی عقیدہ پر حرف آتا ہے تو وہاں وہ بے لاگ اور بے جھجک ختم نبوت سے متعلق اپنے عقیدہ و فکر کو پیش کر دیتے ہیں اور اسی سلسلہ میں کسی قسم کی مداہنت کا شکار نہیں ہوتے۔

اقبال ایک مفکر و مصلح ہونے کے علاوہ اس دور میں مسلمانوں کے نامور سیاسی اور سماجی رہنما بھی تھے۔انہیں بالعموم سیاسی اور سماجی سٹیج پر اپنے خیالات کے اظہار کا موقع بھی ملتا رہتا تھا چنانچہ وہ حسب موقع ہر مقام اور ہر سٹیج پر اپنی فکر اور نظریے کا اظہار کر دیتے تھے۔اس سلسلہ میں انجمن حمایت اسلام لاہور کے صدر اور کشمیر کمیٹی کے ایک متحرک اور موثر ممبر ہونے کی بنا پر اپنے بیانات خطابات کے ذریعہ احمدیت کا اصلی چہرہ عامۃ الناس کے سامنے رکھنے میں انہوں نے اہم ترین کردار ادا کیا ہے۔

[redacted]:

۲۵ جولائی ۱۹۳۱ء کو مرزا بشیر الدین محمود (ابن مرزا غلام احمد قادیانی) نے بعض نامور مسلمانوں کا ایک اجلاس بلا کر ''آل انڈیا کشمیر کمیٹی'' کا قیام عمل میں لایا۔اس کشمیر کمیٹی میں حضرت اقبال اور انکے بعض معتمد ساتھی بھی شامل تھے لیکن ان پر چند ہی دنوں میں یہ حقیقت منکشف ہوگئی کہ مرزا بشیر الدین محمود اس کشمیر کمیٹی کے ذریعہ اور اپنی جماعت کی معرفت کیا گل کھلانا چاہتا ہے۔چنانچہ انہوں نے اس کمیٹی کے دیگر ممبران سے خم ٹھوک کر مطالبہ کیا کہ آل انڈیا کشمیر کمیٹی کا آئندہ سربراہ غیر قادیانی ہونا چاہیے۔اقبال کے اس بیان اور مطالبہ سے مسلمان رہنماؤں میں ایک نئی سوچ پیدا ہونے لگی تو دوسری طرف احمدیت قادیانیت کے پیروکاوں میں صف ماتم بچھ گئی کہ اقبال جیسی ہستی نے یہ مطالبہ کیوں کیا ہے؟

[redacted]:

جن دنوں علامہ اقبال نے آل انڈیا کشمیر کمیٹی کے اراکین سے یہ مطالبہ کیا تھا کہ کمیٹی کا آئندہ سربراہ غیر قادیانی ہونا

چاہیے انہیں دنوں علامہ نے اپنے خاص دوست نواب حمید اللہ خان والی بھوپال کے ذریعہ مہاراجہ کشمیر کو اس امر پر آمادہ کیا تھا کہ وہ مسلمانان کشمیر کے جائز مطالبات کی تحقیق کیلیے ایک کمیشن (کمیٹی) مقرر کریں۔ تو اس پر حکومت کشمیر نے اقبال کی حسب خواہش "گلانسی کمیشن" مقرر کر دیا مگر اس کمیشن میں جو مسلم مطالبات کا جائزہ لینے کیلیے مقرر کیا گیا تھا اس میں مسلم اراکین کی جگہ قادیانیوں کو رکن نامزد کر دیا گیا۔ ان دنوں علامہ اقبال آل انڈیا مسلم کانفرنس کے صدر تھے چنانچہ انہوں نے گلانسی کمیشن کی تشکیل پر اعتراض کیا اور ۲۱ مارچ ۱۹۳۲ء کو منعقد ہونے والے آل انڈیا مسلم کانفرنس کے اجلاس میں حسب ذیل قرارداد منظور کروائی!

> [[گلانسی کمیشن میں جو مسلمان اراکین لیے گئے ہیں انہیں مسلم جماعت سے مشورہ کیے بغیر نامزد کیا گیا ہے اس لیے گلانسی کمیشن کی موجودہ حیثیت اس کانفرنس کیلیے ناقابل قبول ہے۔ یہ کانفرنس حکومت کشمیر سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ مسلم جماعت سے مشورہ کر کے مسلمان اراکین کو مقرر کرے]]۔ (ملخصا شاہد حنیف مفکر پاکستان ص ۳۱۴،۳۱۶)

[redacted]:

کشمیر کی صورتحال کے حوالے سے علامہ اقبال اور ان کے رفقا کا احتجاج اس قدر شدید تھا کہ مرزا بشیرالدین محمود اس کے سامنے ٹھہر نہ سکا۔ چنانچہ اس پر مرزا بشیرالدین محمود نے ۷ مئی ۱۹۳۳ء کو کشمیر کمیٹی کی صدارت سے استعفیٰ دے دیا۔

[redacted]:

مرزا بشیرالدین کے کمیٹی کی سربراہی سے استعفیٰ کے بعد علامہ اقبال کو متفقہ طور پر کمیٹی کا صدر منتخب کیا گیا۔ مگر ان کے انتخاب پر قادیانی حلقے سیخ پا ہو رہے تھے۔ چنانچہ وہ اپنے امیر جماعت کی صدارت و قیادت کے علاوہ کسی دوسرے مسلمان جو غیر قادیانی بھی ہوں کی سربراہی میں کام کرنے پر تیار نہ تھے۔ بایں وجہ وہ ہمیشہ کمیٹی کے اندر تفرقہ و انتشار پھیلانے میں کوشاں رہے۔ قیادت کی کوئی بات ان کیلیے قابل قبول نہ ہوتی تھی۔ یوں جب یہ کشمیر کمیٹی اپنی افادیت کھو بیٹھی۔ جس کو صدر کمیٹی نے بھی ذاتی طور پر محسوس کیا تو علامہ اقبال صرف ایک ماہ بعد ہی کمیٹی کی صدارت سے دست کش ہو گئے اور پریس بیان میں اس کی وجوہات بیان کرتے ہوئے کہا!

> [[بدقسمتی سے کمیٹی میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو اپنے مذہبی فرقے کے امیر کے سوا کسی دوسرے کا اتباع کرنا سرے سے گناہ سمجھتے ہیں۔ مجھے ایسے شخص سے ہمدردی ہے جو کسی روحانی سہارے کی ضرورت محسوس کرتے ہوئے کسی مقبرے کا مجاور یا کسی زندہ نام نہاد پیر کا مرید بن جائے]]۔

اپنے اس بیان پہلے انہوں نے یہ بھی فرمایا کہ!

[[مجھے پتہ چلا ہے کہ یہ لوگ (قادیانی) دراصل کمیٹی کو دو ایسے حصوں میں تقسیم کرنا چاہتے ہیں جن میں اتحاد صرف برائے نام ہو گا چنانچہ میں نے اپنا استعفیٰ پیش کرنے سے پہلے

ممبران کو اپنی رائے سے اچھی طرح آگاہ کر دیا تھا]]۔

اقبال نے استعفیٰ کی مزید وجوہات بیان کرتے ہوئے کہا!

[[ایک صاحب نے مجھے صاف طور پر کہا کہ وہ کسی کشمیر کمیٹی کو نہیں مانتے اور جو کچھ انہوں نے یا ان کے ساتھیوں نے اس ضمن میں کیا وہ ان کے امیر کے حکم کی تعمیل تھی۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں نے ان کے اس بیان سے اندازہ لگایا ہے کہ تمام احمدی حضرات کا یہی خیال ہو گا اور اس طرح میرے نزدیک کشمیر کمیٹی کا مستقبل مشکوک ہو گیا ہے]]۔

[redacted]:

کشمیر کمیٹی میں قادیانیوں کی ریشہ دوانیوں اور ان کی سازشوں کو سامنے رکھتے ہوئے حضرت اقبال نے اسی بیان میں کمیٹی کو ختم کرنے کا مشورہ دیتے ہوئے کہا!

[[جہاں تک مجھے علم ہے کشمیر کمیٹی کی عام پالیسی کے متعلق ممبران میں کسی قسم کا اختلاف نہیں۔ پالیسی سے اختلاف کی بنا پر کسی نئی پارٹی کی تشکیل پر اعتراض کرنے کا کسی کو حق نہیں پہنچتا لیکن جہاں تک میں نے حالات کا جائزہ لیا ہے کشمیر کمیٹی کے چند ارکان کو جو اختلافات ہیں وہ بالکل بے تکے ہیں۔ ان حالات کے پیش نظر مجھے اس امر کا یقین ہے کہ کمیٹی میں اب ہم آہنگی کے ساتھ کام نہیں ہو سکتا اور ہم سب کا مفاد اسی میں ہے کہ موجودہ کمیٹی کو ختم کر دیا جائے]]۔ (ملخصاً مفکر پاکستان ص ۳۱۵، ۳۱۸)

[redacted]:

جب علامہ اقبال نے قادیانیوں کی ستم ظریفیوں سے تنگ آ کر کشمیر کمیٹی کی صدارت سے استعفیٰ دے دیا۔ اور کمیٹی کو عملاً ختم کر دیا تو اس کے بعد قادیانیوں نے "تحریک کشمیر" کے نام سے ایک اور تنظیم قائم کی اور حسب معمول عیاری سے کام لیتے ہوئے علامہ اقبال کو ہی انہوں ان نوزائیدہ تحریک کشمیر کی صدارت کی پیشکش کی لیکن چونکہ وہ مومن تھے جس سے متعلق ارشاد نبوی ﷺ ہے کہ! [[مومن ایک سوراخ سے دوبار نہیں ڈسا جاتا]]۔ اقبال جو کشمیر کمیٹی کی صورت میں پہلے ہی ایک تجربہ کر چکے تھے وہ دوبارہ اس چال میں نہ پھنسے بلکہ اس کے بعد انہوں نے کمال سنجیدگی اور مزید گہرائی کیساتھ قادیانیت اور اسکے

عزائم کا مطالعہ شروع کر دیا چنانچہ وہ فکر و نظر کے نتیجہ میں جان گئے کہ قادیانی اپنے عقائد و نظریات کے فروغ کیلئے تحریک کشمیر کا نام استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ اصل مقصود انکا اپنے مخصوص مفادات کا حصول ہے چنانچہ انہوں نے تحریک کشمیر کی صدارت کی قادیانی پیشکش کو پورے جذبہ ایمانی سے ٹھکرا دیا۔ چنانچہ ۱۲ اکتوبر ۱۹۳۳ء کو انہوں نے قادیانیت کے حوالے سے اپنے دوسرے باطل شکن، قادیانیت سوز بیان میں قصر قادیانیت پر وہ کاری ضربیں لگائیں کہ جس سے اسکے درو دیوار کی ایک ایک اینٹ ہل کر رہ گئی۔

[redacted]:

علامہ مرحوم نے نہ صرف یہ کہ صدارت کی پیشکش کو قبول نہ کیا بلکہ اس سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا!

> [[میں تو ایسی پیشکش کے متعلق سوچنا ہی غلط سمجھتا ہوں۔ یہ پیشکش جو مجھے کی گئی ہے یقیناً ایک فریب ہے]]۔ (شاہد حنیف مفکر پاکستان ص ۴۰)

قادیانیوں کے متعلق علامہ اقبال کے بیانات سے قادیان میں صف ماتم کا بچھنا تو عقل میں آتا ہے مگر اس پر ایک ہندو کا مضطرب ہونا فہم سے بالاتر ہے۔ جب پنڈت جواہر لال نہرو نے قادیانیت کی وکالت کرنا شروع کی اور قادیانیوں سے متعلق مسلمانوں میں عام پائی جانے والی روش پر پریشانی کا اظہار کیا تو اس پر علامہ نے جواہر لال کے اضطراب کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرمایا!

> [[میرا میلان فکر یہ ہے کہ قادیانیت کے بارے میں میرے بیان نے جو اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ ایک مذہبی اصول کی تشریح جدید انداز میں کی گئی تھی۔ (پنڈت جی اور قادیانی) مسلمانوں کے سیاسی مذہبی اتحاد و یکجہتی کے ممکنات کو خصوصیات سے ہندوستان کے اندر ناپسند کرتے ہیں۔ اگرچہ دونوں کے وجوہ مختلف ہیں]]۔ (شورش کاشمیری تحریک ختم نبوت ص ۱۰۴)

[redacted]:

علامہ اپنے بیانات پر قادیانی اضطراب کا اصل سبب بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں!

> [[قادیانی بھی مسلمانان ہند کی سیاسی بیداری پر مضطرب ہیں کیوں کہ محسوس کرتے ہیں کہ مسلمانان ہند کا سیاسی اقتدار بڑھ جائے گا تو قادیانیوں نے رسول عربی ﷺ کی اُمت سے اپنے ہندوستانی نبی کی نئی اُمت نکالنے کے لیے جو منصوبے تیار کر رکھے ہیں۔ وہ یقیناً درہم

برہم ہو جائیں گے۔میں نے مسلمانان ہند کو یہ جتانے کی کوشش کی تھی کہ ہندوستان کے اندرانکی تاریخ کے موجودہ نازک دور میں داخلی اتحاد و ہم آہنگی حد درجہ ضروری ہے اور میں نے ان انتشار انگیز قوتوں کیخلاف انہیں تنبیہ کی تھی جو اصلاحی تحریکات کا لباس پہن کر بروئے کار آئی ہیں۔میرے لیے یہ امر کم حیرت افزا نہیں کہ میری ان کوششوں نے پنڈت جی کیلیے اس قسم کی قوتوں سے اظہار ہمدردی کا موقع بہم پہنچا دیا ہے]]۔(تحریک ختم نبوت ص۱۰۴،۱۰۵)

[redacted]:

یہ ایک حقیقت ہے کہ قادیانیت کے مقابلہ میں علماء کرام تحریر وتقریر، مناظرہ ومباہلہ اور تصنیف وتالیف کے میدان میں برسر پیکار رہے۔انہیں کامیابیاں بھی ملی ہیں لیکن ہر طرح کی کوشش کے باوجود طبقہ علماء کو اس میدان میں مکمل کامیابی بوجوہ حاصل نہیں ہوسکی جس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ نزادنو اور جدید تعلیم یافتہ طبقہ قادیانیوں کے ظاہری اعمال اور ان کی معاشرتی زندگی سے دھوکہ کھاتے ہوئے ہمیشہ انہیں مسلمانوں کا ہی ایک طبقہ اور فرقہ سمجھتا رہا ہے جبکہ ہمارے علماء کا استدلال وہی پرانا تھا۔چنانچہ قادیانیوں کے کفر سے متعلق علماء کی رائے کو بالعموم اسی نقطہ نظر سے دیکھا جاتا تھا۔نتیجۃً قادیانی پھیلتے چلے گئے۔حضرت اقبال اگرچہ جدید تعلیم رکھنے کے باوجود فکر قدیم رکھنے والے ایک مخلص اور سچے مسلمان تھے۔وہ عصر جدید کی زبان سے بھی آگاہ تھے اور اسکے طرز استدلال سے بھی بہرہ ور تھے چنانچہ انہوں نے قادیانی مسئلہ کے حوالے سے ملت اسلامیہ کے جذبات کو بھانپتے ہوئے ہر موقع پر اس کی نبض پر ہاتھ رکھا اور ملی اضطراب کے مرض کی اصلی اور حقیقی وجہ تلاش کی۔پنڈت نہرو کیساتھ اپنی خط وکتابت میں قادیانی مسئلہ کی نزاکت، اسکے مقاصد، اسکے عواقب اور ہندوستانی بالخصوص پنجاب کی مسلم معاشرت پر اس کے ممکنہ مضر اثرات کا دلائل کی روشنی میں جائزہ لیکر آخر میں جچے تلے الفاظ میں قادیانی قضیہ کا جو حل پیش کیا بالآخر ۷ سال بعد علماء اسی پر متفق ہوئے اور پاکستان کی قومی اسمبلی نے بھی اجتماعی طور پر وہی فیصلہ دیا جو بعد میں آئین کا مستقل حصہ قرار پایا اور قادیانی ہمیشہ کیلیے غیر مسلم اقلیت قرار پائے۔

[redacted]:

قادیانی مسئلہ کا حل پیش کرتے ہوئے اقبال لکھتے ہیں!

[[میرے نزدیک حکومت کیلیے بہترین راستہ یہ ہے کہ وہ قادیانیوں کو ایک الگ جماعت قرار دیدے اور ان کی اپنی پالیسی کے بھی عین مطابق ہوگا۔ادھر مسلمان بھی انکے ساتھ وہی رواداری برتیں گے جو وہ باقی مذاہب کے بارے میں اختیار کرتے ہیں]]۔

(حرف اقبال ص۱۰۹)

یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ جس طرح مرزا نے مذہبی رہنما کے روپ میں ایک بہروپیے کا کردار ادا کیا ہے ہماری تاریخ میں اور بھی بہت سے کردار ایسے پائے جاتے ہیں جنہوں نے منبر و محراب اور جبہ دستار کی آڑ میں دین اسلام اور ایمان کی بنیاد و اساس پر سخت حملے کیے۔ دل کھول کر اہانت رسول کی۔ اپنی مذعومہ شیطانی توحید کے تسور کو عام کرنے کیلیے مقام رسالت کو مشکوک بنانے کی سعی بد کی۔ جس کے نتیجے میں بالآخر اُمت مختلف گروہوں میں بٹ گئی۔ ایسی ہی جدید گروہ بندیوں میں سے ایک طبقہ ہندوستان کے ضلع سہارنپور کے ایک گاؤں "دیوبند" میں پیدا ہونے والا بھی ہے۔ اس کے اپنے مخصوص عقائد و نظریات میں بالخصوص شان رسالت میں تنقیص کرنا ان کی ایک خاص علامت ہے۔

علامہ محمد اقبال نے اس مخصوص گروہ اور قادیانیت پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا تھا!

[[قادیان اور دیوبند اگرچہ ایک دوسرے کی ضد ہیں لیکن دونوں کا سرچشمہ ایک ہے اور دونوں اس تحریک کی پیداوار ہیں جسے عرف عام میں وہابیت کہا جاتا ہے]]۔ نذیر نیازی سید: اقبال کے حضور حصہ اول ص۲۶۱ طبع اول ۱۹۷۱ء اقبال اکادمی کراچی)

☆☆☆☆ ☆☆☆☆ ☆☆☆☆

اسلام اور قادیانیت

حکیم الامت شاعر مشرق ڈاکٹر علامہ محمد اقبال قادری رحمۃ اللہ علیہ

مرتب: لطیف احمد شیروانی

مترجم: محمد روز خان

مترجم کی طرف سے تعارف:

زیر نظر علمی مواد حکیم الامت علامہ محمد اقبال کی تحریروں، تقریروں اور بیانات پت مبنی جناب لطیف احمد شیروانی کی تالیف کے صفحہ نمبر ۱۷۱ تا ۲۰۰ حصہ سوم کے طور پر درج ذیل عنوانات کے نام سے پھیلا ہوا ہے۔

۱۔ قادیانیت اور صحیح العقیدہ مسلمان

۲۔ مجلہ نور وغیرہ کی بحث کا جواب

۳۔ روزنامہ سٹیٹس مین کو ایک خط

۴۔ رومن حکمرانی میں یہود کی سالمیت

۵۔ اسلام اور احمدیت

۶۔ احمدیوں کے بارے میں پنڈت جواہر لال نہرو کو لکھا گیا خط مورخہ ۲۱ جون ۱۹۳۶ء

یہ مواد وقتاً فوقتاً مختلف سمتوں سے اٹھائے گئے اعتراضات کے جوابات کے طور پر وجود میں آیا اس کا مطالعہ اس امر پر سیر حاصل روشنی ڈالتا ہے کہ حضرت اقبال کی دوررس نگاہ میں مسئلہ ختم نبوت کتنا اہم ہے اس کتاب کے ایڈیشن ۱۹۴۴ء، ۱۹۴۸ء، ۱۹۷۷ء میں شائع ہوئے۔ کتاب کا پہلا ایڈیشن مولف نے "شاملو" کے قلمی نام سے شائع کرایا۔ وقت گزرنے کیساتھ ساتھ کتاب کے حجم میں اضافہ ہوتا رہا۔ کتاب کا ۱۹۷۷ء والا ایڈیشن اقبال اکادمی لاہور کا شائع کردہ ہے یہی ایڈیشن راقم کے سامنے ہے۔

مترجم نے مرتب کے حواشی کیساتھ ساتھ مزید حواشی دیے ہیں۔ ترجمہ سے استفادہ میں آسانی کے لیے مشکل الفاظ کے معانی بھی قوسین میں دیئے ہیں۔ (محمد روز خان)

۱۔ قادیانیت اور صحیح العقیدہ مسلمان: (۱)

قادیانیوں اور صحیح العقیدہ مسلمانوں میں مباحثہ کی وجہ سے پیدا شدہ مسئلہ انتہائی اہم ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں نے ابھی سے اسکی اہمیت کو محسوس کرنا شروع کیا ہے۔ میرا ارادہ تھا کہ مسئلہ کے سماجی اور سیاسی مضمرات (پوشیدہ باتیں یا معاملات) کی وضاحت کرتے ہوئے انگریز قوم کو ایک کھلا خط لکھوں لیکن بدقسمتی سے میری صحت نے مجھے ایسا کرنے سے روک دیا۔ پھر بھی ایک ایسے معاملہ پر جو میرے خیال میں ہندوستانی مسلمانوں کی تمام اجتماعی زندگی پر اثر انداز ہوتا ہے۔ چند الفاظ پیش کرنے پر خوش ہوں۔ ہاں اس بات کی مکمل کرنشاندہی کی جاتی ہے کہ میرا کسی دینی بحث میں پڑنے کا کوئی ارادہ نہیں اور نہ میرا مطلب قادیانی تحریک کے بانی کے ذہن کا نفسیاتی تجزیہ کرنے کا ہے۔ اول الذکر اُن لوگوں کے لیے دلچسپی کا باعث نہیں ہوگا جن کے لیے یہ بیان کرنا مقصود ہے اور موخر الذکر کے لیے ہندوستان میں ابھی وہ وقت نہیں آیا۔ میرا نکتۂ نگاہ عمومی تاریخ اور تقابل دین کے ایک طالب علم کا ہے۔

ہندوستان بہت سے مذہبی گروہوں کی سرزمین ہے۔ اور اسلام ان مذہبی گروہوں کے مقابلے میں جن کا کچھ ڈھانچہ مذہبی اور کچھ نسلی نظریہ سے متعین ہوتا ہے زیادہ گہرے مفہوم میں دینی قوم ہے۔ اسلام نسلی نظریہ کو مجموعی طور پر مسترد کرتا ہے اور اسکی بنیاد محض دینی نظریہ پر استوار کرتا ہے۔ اسلام اپنے آپ کو صرف اور صرف دینی نظریہ پر استوار کرتا ہے۔ جو نظریہ مکمل طور پر روحانی اور نتیجۃً خونی رشتہ سے بہت زیادہ لطیف اور آسانی ہے۔ مسلم معاشرہ قدرتی طور پر ان قوتوں کے بارے میں زیادہ حساس ہے۔ جنھیں وہ اپنے استحکام کے لیے مضر خیال کرتا ہے۔ کوئی مذہبی معاشرہ جو تاریخی طور پر اسلام کے اندر سے ابھرتا ہے اور جو اپنی بنیادوں کے لیے نئی نبوت کا دعویٰ کرتا ہے اور اعلان کرتا ہے کہ وہ تمام مسلمان کافر ہیں جو مبینہ وحیوں کی سچائی تسلیم نہیں کرتے اس مذہبی معاشرہ کو ہر مسلمان لازماً اسلام کی سالمیت کیلیے سنجیدہ خطرہ تصور کرے گا۔ یہ ضرور بالضرور ہونا چاہیے کیونکہ مسلم معاشرہ کی سالمیت کا حصول فقط ختم نبوت کے نظریہ سے ہے۔

یہ نظریہ خاتمیت شاید بنی نوع انسان کی ثقافتی تاریخ میں نہایت قدیمی نظریہ ہے۔ اس کی اہمیت صحیح طور پر وہ لوگ جان سکتے ہیں جو قبل از اسلام مغربی اور وسطی ایشیاء کی مجوسی ثقافت کی تاریخ کا محتاط مطالعہ کرتے ہیں۔ جدید تحقیق کے مطابق مجوسی ثقافت کے تصور میں زرتشت، یہودی، عیسائیت، چاریائی اور صابی مذہبوں سے وابستہ ثقافتیں شامل ہیں۔ اس عقیدہ کی حامل قوموں کے ہاں نبوت کے تسلسل کا نظریہ ضروری تھا۔ نتیجۃً وہ مسلسل اُمید کی حالت میں رہتے تھے۔ غالباً مجوسی انسان نفسیاتی طور پر امید کی اس حالت سے استفادہ کرتے دور جدید کا انسان روحانی طور پر مجوسی انسان سے بہت زیادہ آزاد ہے۔ مجوسی رویہ کا نتیجہ قدیم اقوام کا عدم استحکام اور تمام قسموں کے مذہبی مہم جوؤں کی تشکیل جدید تھا۔ جدید دنیائے اسلام میں حریص اور جاہل ملائیت نے جدید پریس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ۲۰ ویں صدی کے چہرے پر قبل از اسلام کے پرانے مجوسی نکتہ نظر کو زور سے پھینکنے کی بے شرمی کی حد تک کوشش کی۔ ظاہری بات ہے کہ اسلام جو دنیا کی تمام مختلف اقوام کو ایک قوم کے طور

پر جوڑنے کا مدعی ہے۔ وہ خود کسی ایسی تحریک سے سمجھوتہ نہیں کر سکتا جو اس کے استحکام کے لیے خطرہ ہو اور جو انسانی معاشرہ میں مزید دراڑیں ڈالنے پر کاربند ہو ان دو شکلوں میں سے جو قبل از اسلام کی مجوسیت کے جدید احیاء نے اختیار کی ہو مجھے قادیانیت سے بہائیت بہت زیادہ دیانتدار نظر آتی ہے کیونکہ بہائیت اسلام سے کھلم کھلا انحراف (منہ موڑنا) کرتی ہے جبکہ قادیانیت باطن میں مکمل طور پر اسلام کے ولولہ اور تمنائے عروج سے معاندت کیساتھ بظاہر اسلام کے کچھ زیادہ اہم ظواہر کو اپنائے رکھتی ہے۔ اس کا ایک حاسد خدا کا تصور جو اپنے مخالفوں کیلیے زلزلوں اور طاعون کا وافر ذخیرہ رکھتا ہے۔ اس کا نبی کو کاہن سمجھنے کا تصور اس کا روحِ مسیح کے تسلسل کا تصور اتنے مکمل طور پر یہودانہ ہے کہ اس کی تحریک کو بڑی آسانی سے شروع کی یہودیت کی طرف رجوع گردانا جا سکتا ہے۔ روحِ مسیح کے تسلسل ٹھوس یہودیت کے مقابلے میں زیادہ تر یہودی تصوف سے تعلق رکھتا ہے۔ پروفیسر بوبر جس نے پوش مسیح بالشیم کی شروع کردہ تحریک کا جائزہ لیا ہے ہمیں بتاتا ہے کہ یہ خیال کیا گیا تھا کہ روحِ مسیح علیہ السلام انبیاء کے توسل سے زمین پر اترتی ہے۔ اور اگرچہ نفوس قدسیہ (صادقین) کی ایک طویل قطار موجودہ وقت میں پھیلی ہوئی ہے قبل از اسلام کے مجوسی نظریات کے دباؤ کے تحت مسلم فارس میں بدعتی تحریکوں نے بار بار کی تجسیم نو کے نظریہ پر پردہ ڈالنے کے لیے دوبارہ بروز، حلول اور ظل کے الفاظ ایجاد کر لیے۔ مسلم شعور کے لیے کم صدمہ رساں بنانے کے لیے ایک مجوسی نظریہ کے لیے نئے اظہارات ایجاد کرنا ضروری تھا۔ حتیٰ کہ مسیح موعود کی ترکیب الفاظ مسلمانوں کے مذہبی شعور کی پیداوار نہیں ہے۔ یہ ایک ناجائز اظہار ہے اور اس کا آغاز قبل از اسلام کے مجوسی نکتۂ نظر میں ہے۔

ہم اس نظریہ کو پہلے وقتوں کے اسلامی، دینی اور تاریخی ادب میں نہیں پاتے۔ اس نمایاں حقیقت کا انکشاف پروفیسر ونس نک کی کتاب "پیغمبر پاک کی احادیث میں ہم آہنگی" نے کیا یہ کتاب کم از کم احادیث کے گیارہ مجموعوں اور اسلام کی اولین تاریخ کی تین دستاویزات پر مشتمل ہے۔ اگلے وقتوں کے مسلمانوں کے اس بیان کی طرف کبھی توجہ نہ کرنے کی وجہ ایک انسان بخوبی سمجھ سکتا ہے۔ اس بیان (مسیح موعود سے متعلق) نے اُنھیں غالباً اس وجہ سے متاثر نہیں کیا کہ ان کے خیال میں یہ بیان تاریخی عمل کے ایک غلط تصور کی دلالت کرتا تھا۔ مجوسی ذہن وقت کو ایک پابند دائرہ حرکت خیال نہیں کرتا تھا۔ ایک مسلسل تخلیقی تحریک کے طور پر تاریخی عمل کی صحیح نوعیت کی وضاحت کی ناموری عظیم مسلمان مفکر اور مورخ ابن خلدون کے لیے مختص تھی۔ لہٰذا ہندوستانی مسلمانوں نے قادیانی تحریک کی مخالفت میں جس شدتِ جذبات کا اظہار کیا ہے وہ جدید عمرانیات (انسانی معاشرت، رہنا سہنا کا علم) کے طالب علم کے لیے بالکل قابل فہم ہے اوسط درجے کا مسلمان جسے اگلے دن سول اینڈ ملٹری گزٹ کے لکھاری نے نظریہ ختم نبوت کو پوری طرح سمجھنے کی بجائے قادیانی تحریک کی مخالفت پر زیادہ تر تحفظ ذات کے لیے متاثر ہوا ہے نام نہاد روشن خیال مسلمان نے شاذ و نادر ہی اسلام میں عقیدہ ختم نبوت کی حقیقی ثقافتی اہمیت سمجھنے کی کوشش کی ہے اور آہستہ اور غیر محسوس انداز میں تحریک مغربیت نے اُسے مزید تحفظ ذات کے جبلی وصف (پیدائش سے ساتھ

ساتھ رہنے والے اوصاف) سے بھی محروم کر دیا ہے۔ان نام نہاد روشن خیال مسلمانوں میں سے کچھ اپنے برادرانِ ایمانی کو برداشت کی تبلیغ کرنے کی حد تک جا چکے ہیں۔میں سر ہربرٹ ایمرسن (۲) جنھوں نے مسلمانوں کو رواداری کا مشورہ دیا ہے سے بڑی آسانی سے صَرفِ نظر کر سکتا ہوں کیونکہ ایک یورپی باشندہ جو ایک مختلف ثقافت میں پیدا ہوا اور پلا بڑھا بصیرت میں ایسا اضافہ نہیں کرتا یا شاید نہیں کر سکتا جو بصیرت کسی فرد کیلیے ایسا مسئلہ سمجھنا ممکن بنا دے جو مسئلہ ایک انتہائی مختلف ثقافتی نکتۂ نظر رکھنے والی قوم کے ڈھانچے کیلیے بہت مہلک ہو۔

ہندوستان میں حالات بہت زیادہ مخصوص نوعیت کے ہیں۔مذہبی قوموں کا یہ ملک جہاں ہر قوم کا مستقبل اس کی سالمیت میں ہے اور اس پر اہل مغرب حکمرانی کرتے ہیں جو مذہب میں عدم مداخلت کی پالیسی کے سوا اختیار نہیں کر سکتے۔یہ فراخدلانہ اور ناگزیر پالیسی ہندوستان ایسے ملک میں بے جا نتائج پر منتج ہوئی ہے جہاں تک اسلام کا تعلق ہے یہ کہنا مبالغہ آرائی نہیں ہے کہ انگریزوں کے ماتحت ہندوستان میں مسلمانوں کی سالمیت رومیوں کے ماتحت مسیح علیہ السلام کے دور میں یہودی قوم کی سالمیت کے مقابلے میں بہت ہی کم محفوظ ہے۔ہندوستان میں کوئی مذہبی مہم جو اپنا ناجائز فائدہ اٹھانے کے لیے کوئی دعویٰ کر سکتا ہے۔اور نئی قوم تراش سکتا ہے ہماری یہ روادار ریاست کسی اصل قوم کی ایک انجیر کے برابر بھی پروا نہیں کرتی بشرطیکہ مہم جو (حکومت کو) اپنی وفاداری کا یقین دلائے اور اس کے پیروکار باقاعدگی سے ریاست کو ٹیکس دیتے رہیں۔اسلام کے لیے اس پالیسی کا مفہوم ہمارے عظیم شاعر اکبر نے بالکل درست طور پر لیا ہے۔جو حسب معمول اپنے ظریفانہ اسلوب میں کہتا ہے

گورنمنٹ کی خیر مناؤ یارو   انا الحق کہو اور پھانسی نہ پاؤ

(دوستو اہل برطانیہ کی ناموری کے لیے دعا گو رہو خدائی کا دعویٰ کرو اور زنجیروں، پھانسی اور رسوائی سے بھی بچے رہو)

میں عقیدہ کے پختہ ہندوؤں کی بہت زیادہ تعریف کرتا ہوں جو نئے دستور میں مذہبی تشکیل نو کے حاملین کے خلاف تحفظ کا مطالبہ کرتے ہیں۔واقعتاً یہ مطالبہ مسلمانوں کو پہلے کرنا چاہیے تھا جو ہندوؤں کے برعکس سماجی ڈھانچے سے نسلی نظریہ کو یکسر خارج کرتے ہیں حکومت کو موجودہ صورتِ احوال پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے اور اگر ہو سکے تو کوشش کرے کہ وہ عام مسلمان کی ذہنی کیفیت کو سمجھے جو اپنی قوم کے استحکام کے لیے اس کو مطلقاً مہلک خیال کرتا ہے۔بہر حال اگر کسی طبقہ کے استحکام کو خطرہ ہو تو اس طبقے کیلیے ایک ہی راستہ کھلا ہے اور وہ ہے اس کا انتشار کی قوتوں کے خلاف اپنا دفاع کرنا۔تو پھر اپنے دفاع کے طریقے کیا ہیں۔

بحث و مباحثہ پر مشتمل تحریریں اور اس شخص کے دعووں کو غلط ثابت کرنا جس کو اس کی آبائی قوم ایک مہم جو خیال کرتی ہو۔کیا یہ انصاف پر مبنی ہے کہ آبائی قوم کو رواداری کا درس دیا جائے جس کے استحکام کو خطرہ ہو اور اگر سرکش گروہ کو سزا سے بے

خوبی کیساتھ تشہیری مہم جاری رکھنے کی اجازت دی جائے جبکہ تشہیری مہم بہت زیادہ مہذبانہ نہ بھی ہو؟ اگر اپنے آبائی نکتۂ نظر سے باغی ایک گروہ حکومت کے لیے کچھ خصوصی خدمات کرنے والا واقع ہو تو حکومت کو آزادی ہے کہ وہ جس طرح بھی ان کی خدمات کا صلہ دے سکتی ہے دے۔ دوسرے طبقات اس سے بغض رکھیں گے لیکن اس بات کی توقع رکھنا بہت زیادہ غیر مناسب ہوگی کہ کوئی قوم اُن قوتوں کو خاموشی سے نظر انداز کر دے جو اس کی اجتماعی زندگی پر تشویشناک حد تک اثر انداز ہونے کیطرف میلان رکھتی ہو۔ اجتماعی زندگی اپنی تحلیل کے حوالے سے اتنی ہی حساس ہے جتنی انفرادی زندگی۔ اس سلسلے میں مزید کچھ کہنا شاید ہی ضروری ہو کہ مسلم فرقوں کا دین سے متعلق معمولی باتوں پر الجھنا ان کے باہمی کفر و بدعت کے الزامات کے باوجود زندگی کے قوی اُصولوں پر اثر انداز نہیں ہوگا۔ ایک مزید نکتہ ہے جو حکومت کی خصوصی توجہ کا طالب ہے۔ ہندوستان میں مذہبی مہم جو کی جدید روشن خیالی کی بنیاد پر حوصلہ افزائی لوگوں کو مذہب کے بارے میں زیادہ سے زیادہ لاتعلق رکھنے کی طرف میلان رکھتی ہے اور آخر کار ہندوستانی اقوام کی زندگی سے اہم مذہبی عنصر کو خارج کر دے گی۔ پھر ہندوستانی ذہن مذہب کا کوئی اور بدل تلاش کرے گا جس کا امکان ہے کہ وہ دہریانہ مادہ پرستی کی شکل جو روس میں ظاہر ہو چکی ہے سے کچھ بھی کم نہ ہوگا۔

لیکن مذہبی مسئلہ ہی صرف وہ مسئلہ نہیں جو پنجابی مسلمانوں میں اضطراب پیدا کر رہا ہے۔ میرے مطالعہ کے مطابق سیاسی نوعیت کے دوسرے جھگڑے (بھی) ہیں جن کی طرف سر ہربرٹ ایمرسن نے انجمن (۳) کی سالگرہ پر اپنے خطاب میں اشارہ کیا ہے۔ بلاشبہ سیاسی نوعیت کے بھی ہیں لیکن وہ پنجابی مسلمانوں کی وحدت پر اس خطرناک حد تک اثر انداز ہو رہے ہیں جتنا مذہبی مسئلہ۔ حکومت کی پنجابی مسلمانوں کو متحد دیکھنے کیلیے فکرمندی کا شکریہ ادا کرتے ہوئے میں تجویز کرنے کی جسارت کروں گا کہ حکومت تھوڑا سا اپنی پالیسیوں کا جائزہ لے۔ میں مسلمانوں میں شہری اور دیہاتی کی تفریق کے بارے میں پوچھتا ہوں جس تفریق نے مسلمان قوم کو کاٹ کر دو گروہوں میں تقسیم کر دیا ہے اور دیہاتی گروہ بہت سے ذیلی گروہوں میں بٹ کر مسلسل ایک دوسرے کیساتھ حالت جنگ میں ہے۔

سر ہربرٹ ایمرسن کو افسوس ہے کہ پنجابی مسلمانوں میں باقاعدہ قیادت کا فقدان ہے لیکن میں سر ہربرٹ کو احساس دلانا چاہوں گا کہ دیہاتی اور شہری کی تقسیم حکومت نے پیدا کی ہے۔ پھر اسے حریص سیاسی مہم جوؤں کے ذریعے برقرار رکھا ہے۔ جن کی نگاہیں اپنے ذاتی مفادات پر جمی ہیں۔ حالانکہ پنجاب میں اتحادِ اسلام پر اس امر نے مسلمانوں کو پہلے ایک حقیقی رہنما پیدا کرنے کا اہل نہیں چھوڑا۔ مجھے نظر آ رہا ہے کہ یہ سکیم اس لیے بھی وجود میں لائی گئی ہے کہ حقیقی قیادت کا پنپنا ہی ناممکن بنا دیا جائے سر ہربرٹ ایمرسن کو مسلمانوں میں قیادت کے فقدان پر افسوس ہے۔ مجھے تو حکومت کی طرف سے ایسے نظام کے تسلسل پر افسوس ہے جس نے صوبے میں حقیقی قائد کے ظہور کی تمام امیدوں کو کچل کر رکھ دیا ہے۔

پس تحریر:

میں سمجھتا ہوں کہ اس بیان نے بعض لوگوں میں کچھ غلط فہمی پیدا کی ہے۔ یہ سوچا گیا ہے کہ میں نے حکومت کو طاقت کے بل بوتے پر قادیانی تحریک دبا دینے کی نہایت گہری تجویز دی ہے اس طرح کی کوئی چیز نہیں۔ میں نے واضح کر دیا ہے کہ مذہب میں عدم مداخلت کی پالیسی ہی ایسی پالیسی ہے جسے ہندوستان کے حکمران اپنا سکتے ہیں کسی اور پالیسی کا امکان نہیں ہے۔ مجھے تسلیم ہے کہ میری سوچ کے مطابق ہر پالیسی مذہبی اقوام کے مفادات کے لیے نقصان دہ ہے لیکن اس سے بچاؤ کا کوئی ذریعہ نہیں اور جو بھگت رہے ہیں ان کو مناسب طریقوں سے اپنے مفادات کا تحفظ کرنا ہوگا۔ میرے نکتہ نظر سے ہندوستان کے حکمرانوں کے لیے مناسب راستہ یہی ہے کہ وہ اعلان کر دیں کہ قادیانی ایک علیحدہ قوم ہیں ایسا کرنا قادیانیوں کی اپنی پالیسی کے عین مطابق ہوگا۔ اور ہندوستان کے مسلمان بالکل دوسرے مذاہب کی طرح ان کو گوارا کر لیں گے۔

۲۔ مجلہ نور وغیرہ کی بحث کا جواب:

[گذشتہ بیان پر نکتہ چینی کرتے ہوئے مجلہ نور (قادیانی ہفت روزہ) نے رائے زنی کی۔ دوسرے عظیم مفکروں کی طرح وہ (ڈاکٹر اقبال) الفاظ کی وحی کے ذریعہ اللہ اور بندے میں راز و نیاز پر یقین نہیں رکھتے۔ اس الزام کے بارے میں پریس کے ایک نمائندے نے انٹرویو کیا ڈاکٹر اقبال نے فرمایا!]

مجلہ نور نے اس الزام کی بنیاد میرے ایک اردو شعر پر رکھی ہے!

ہم کلامی ہے غیرت کی دلیل　　　خامشی پر مٹا ہوا ہوں میں

یہ سادہ سی اردو ہے اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ انسان کی روحانی زندگی میں الفاظ پر مبنی راز و نیاز سے بلند ایک سطح ہے لیکن شعر کا الفاظ پر مبنی نظریہ سے بطور دینیاتی نظریہ کے کوئی تعلق نہیں اس کے لیے میں مجلہ نور کو اپنی کتاب ''تشکیل جدید'' (۴) کا ضرور حوالہ دوں گا۔ اس کتاب میں میں نے صفحہ نمبر ۲۱ پر لکھا!

> ''احساس اور خیال کا عضویاتی تعلق (جیسے اعضاء کا باہم تعلق ہوتا ہے) الفاظ پر مبنی وحی کے بارے میں قدیم دینیاتی مباحثہ جس نے ایک دفعہ مسلمان دینی مفکرین کو اذیت میں مبتلا کر دیا تھا پر روشنی ڈالتا ہے۔ واضح طور پر بیان نہ کیا جا سکنے والا احساس فکر میں اپنا نصیبہ پورا کرنا چاہتا ہے۔ جو اپنی باری پر نظر آ سکنے والے لباس کی صورت میں نشو نما دے سکتا ہے۔ یہ کہنا محض کوئی استعارہ نہیں کہ سوچ اور لفظ دونوں ایک ساتھ احساس کی کوکھ سے نکلتے ہیں۔ اگرچہ منطقی فہم انھیں زمانی ترتیب دے سکتا ہے۔ اور انھیں باہم جدا جدا گمان کر کے اپنے لیے مشکل پیدا کر سکتا ہے ایک مفہوم میں لفظ کی بھی وحی کی جاتی ہے''۔

[مجلہ نور کی پیش کی گئی روایت کہ ہر صدی کے آغاز پر مجددین ظہور پذیر ہوتے ہیں کے بارے میں سوال پر ڈاکٹر

اقبال نے فرمایا!]

مدیر نور روایت نقل کرتا ہے جو بالکل ریاضی کے انداز میں تاریخی عمل کی تصویر پیش کرتی ہے۔ میرا جبکہ انسان کی روحانی صلاحیت اور روحانی انسان کی پیدائش کے امکان پر یقین ہے۔ مجھے یہ یقین نہیں کہ تاریخی عمل اس طرح ریاضیاتی ہوتا ہے جس طرح مجلّہ نور کا خیال ہے۔ ہم با آسانی تسلیم کر سکتے ہیں کہ تاریخی عمل کی نوعیت کو سمجھ لینا ہماری ذہنی صلاحیت سے ورا ہے۔ میں اس کے خلاف جو کہہ سکتا ہوں وہ سارا یہ ہے کہ مجھے یہ نظر آتا ہے کہ یہ اسی طرح طے شدہ اور بالکل ریاضی کے انداز میں نہیں تھے جیسا کہ مجلّہ نور کا خیال ہے۔ میرا قدرے ابن خلدون کی طرف میلان ہے جو تاریخی عمل کو ایک آزاد تخلیقی تحریک خیال کرتا ہے اور ایسا عمل خیال نہیں کرتا جو پہلے ہی ایک حتمی نشاندہی کیساتھ عمل میں لایا جا چکا ہے۔ یہ نقطۂ نظر نئے وقتوں میں ابن خلدون سے زیادہ وضاحت اور سائنسی صحت کیساتھ برگسان نے پیش کیا ہے۔ مجلّہ نور کی نقل کی روایت کو غالباً جلال الدین سیوطی نے اپنے مفاد کیلیے مقبول عام بنایا ہے۔ اور اسے زیادہ اہمیت نہیں دی جا سکتی۔ یہ روایت بخاری اور مسلم جن دو کتابوں کو زیادہ قابل بھروسہ مانا جاتا ہے نے نقل نہیں کی۔ یہ کچھ روحانی حضرات کی تاریخی عمل کی نوعیت کی بصیرت ہو سکتی ہے لیکن یہ افراد کی ذاتی بصیرت منطقی استدلال کے لیے کوئی بنیاد نہیں بن سکتی۔ یہ وہ اصول ہے جسے ماہر رواۃ نے ہمیشہ مدنظر رکھا ہے۔

[سوال کیا گیا کہ کیا انہوں نے طلوع آفتاب (جو ایک قادیانی ہفت روزہ ہے) میں شائع شدہ ایک لیکچر دیکھا ہے جس میں مصنف نے ڈاکٹر اقبال کے ایک لیکچر کا حوالہ دیا ہے اور ان پر تضاد کا الزام لگایا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے جواباً فرمایا!]

جی مجھے افسوس ہے میرے پاس مطلوبہ لیکچر کی کوئی نقل نہیں نہ اصل انگریزی میں نہ اردو ترجمہ میں جو مولانا ظفر علی خان نے کیا تھا۔ جہاں تک مجھے یاد آ رہا ہے وہ لیکچر ۱۹۱۱ء یا اس سے قبل دیا تھا۔ مجھے یہ تسلیم کرنے میں کوئی جھجک نہیں کہ ربع صدی قبل مجھے اس تحریک سے اچھے نتائج برآمد ہونے کی توقع تھی۔ پہلے پہل حتیٰ کہ ممتاز مسلمان مولوی چراغ علی مرحوم نے جو اسلام پر بہت سی انگریزی کتب کے مصنف ہیں تحریک کے بانی کے ساتھ تعاون کیا تھا اور میں سمجھتا ہوں انہوں نے براہین احمدیہ نامی کتاب میں قابل قدر حصہ لیا تھا۔ لیکن ایک مذہبی تحریک کی اصل ما فیہ اور اس کی روح اپنا آپ ایک دن میں ظاہر نہیں کرتی۔ یہ اپنے آپ کے کھلنے میں عشرے لیتی ہے۔

تحریک کے دونوں فریقوں کے اندرونی جھگڑے اس حقیقت کا ثبوت ہیں کہ جو لوگ بانی کیساتھ ذاتی طور پر رابطے میں تھے وہ بھی کلی طور پر باخبر نہ تھے کہ تحریک کی نشوونما کیسے ہوگی؟۔ ذاتی طور پر میں تحریک کے بارے میں اس وقت شکوک و شبہات میں مبتلا ہوا جب غیر مبہم انداز میں بانی اسلام کی نبوت سے برتر ایک نئی نبوت کا دعویٰ سامنے لایا گیا اور دنیائے اسلام کو کافر قرار دیا گیا۔ بعد ازاں میرا شک بڑھ کر قطعی بغاوت ہو گیا۔ جب میں نے تحریک سے وابستہ ایک کو تقدس مآب پیغمبر اسلام کا ذکر حقارت آمیز زبان میں کرتے اپنے کانوں سے سنا۔ آپ ان کی جڑوں کی بجائے ان کے ثمرات سے اُنھیں جانیں

گے۔اگر میرا موجودہ انداز آپ سے تضاد کا شکار ہو رہا ہے تو خوب صرف ایک زندہ اور سوچتے انسان کو اپنی سوچ سے اختلاف کرنے کا حق ہے۔صرف پتھر ہی اپنے برعکس نہیں کرتے۔جیسے ایمرسن کہتا ہے!"ان سے اللہ کی جانب سے وحی کے امکان اور پیغمبر پاک کے بعد وحی حاملین مصلحین کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ نے جواب دیا"۔

بہتر یہ ہے کہ میں اس سوال کا جواب آپ کو اپنی "اسلام میں الٰہیات کی تشکیل جدید" کا حوالہ دیکر دوں جس کے صفحہ ۱۲۱،۱۲۲ پر میں نے لکھا!"نظریہ ختم نبوت یوں نہ لینا چاہیے کہ زندگی کا حتمی مقدر آخر کار عقل کا جذبہ کی مکمل جگہ لینا ہے۔اس طرح کی کوئی چیز نہ ممکن ہے نہ مطلوب ہے۔نظریہ کی فراست پر مبنی قدر یہ ہے کہ اس کا رجحان اس طرف ہے کہ صوفیانہ تحریر کی جانب ایک آزاد ناقدانہ رویہ یہ عقیدہ اپنا رکھا جائے کہ تاریخ انسانی میں یہ عقیدہ کہ تمام شخصی اتھارٹی جو اپنے مافوق الفطرت ظہور کا دعویٰ کرتی ہو ختم ہو چکی ہے۔عقیدہ کی یہ قسم ایک نفسیاتی قوت ہے جو اپنے اختیار کی نشوونما کرتی ہے اس عقیدہ کا مقصد انسان کے باطنی تجربہ کے میدان میں علم کے تازہ مناظر (کا باب) کھولا جائے جو بالکل اس طرح جیسے اسلام کے پہلے نصف کلیہؐ نے انسان کے خارجی تجربہ کے ناقدانہ مشاہدہ کی روح پیدا کی ہے اور اسکی نشوونما کی ہے کہ فطرت کی قوتوں کو اس خدائی کردار سے محروم کر دیا جائے جس کے ساتھ اگلی ثقافتوں نے اُنھیں لباس پہنایا تھا تو صوفیانہ تجربہ کتنا ہی غیر معمولی ہو اب مسلمان اُسے مکمل فطرتی تجربہ خیال کریں جو انسانی تجربات کے دوسرے پہلوؤں کی طرح ناقدانہ چھان بین کے لیے کھلا ہو یہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ابن صیادؓ کے نفسیاتی تجربہ کی جانب رویہ سے واضح ہے۔اسلام میں تصوف کا مقصد صوفیانہ تجربہ کو کسی ضابطہ کے تحت لاتا رہا ہے۔گرچہ یہ ضرور تسلیم کیا جائے کہ ابن خلدون ہی وہ واحد مسلمان تھا جو ایک مکمل سائنسی جذبہ کے تحت اس تک پہنچا۔

شروع کا جملہ صاف بتاتا ہے کہ لفظ کے نفسیاتی مفہوم میں اولیاء یا اولیائی کردار کے لوگ ہمیشہ ظاہر ہوتے رہین گے۔آیا مرزا صاحب اس قسم سے تعلق رکھتے تھے یا نہیں یہ ایک علیحدہ سوال ہے۔واقعی جب تک بنی نوع انسان کا روحانی ظرف برداشت کرتا رہے گا وہ انسان کو زندگی کے بہتر مثالی تصورات (نہایت اعلیٰ خیالات یا اوصاف) دکھانے کیلیے تمام ملکوں اور قوموں سے اُبھرتے رہیں گے کوئی دوسری رائے رکھنا انسانی تجربات کے معنی پر مکھیوں کا اُڑانا ہے۔فرق صرف اتنا ہے کہ جدید انسان کو اپنے صوفیانہ تجربات کا ناقدانہ جائزہ لینے کا حق ہے۔ختم نبوت کا مطلب دوسرے نکات سمیت یہ ہے کہ دینی زندگی میں ہر طرح کی شخصی اتھارٹی جس کا انکار دائمی عذاب میں مبتلا کرتا ہے ختم ہو چکا ہے۔

["سٹیٹس مین" میں ایک پارسی نوجوان مسٹر ڈن شا کی طرف سے ایک شائع شدہ مکتوب کے بارے میں سوال کیا گیا۔ڈاکٹر اقبال نے فرمایا!]

میرے پاس اس کے بارے میں کہنے کو اس کے سوا کچھ نہیں کہ میں اس کے بڑے دعویٰ کہ اسلام کی خارجی اور داخلی

تاریخ میں ایرانی عنصر کے بہت زیادہ کردار سے پوری طرح متفق ہوں۔ ایرانی اثر ورسوخ اتنا پھیلا ہوا ہے کہ سپنگلر کو اسلام کی مجوسیانہ ملمع کاری کا دھوکہ ہوا ہے۔ اور اس نے عملاً اسلام کو مجوسی مذہب سمجھ لیا ہے۔ میں نے اپنی ''تشکیل جدید'' میں کوشش کی ہے کہ اسلام کو اس پر چڑھے خول سے آزاد کر دوں اور مجھے اُمید ہے کہ میں اس بارے میں اپنی کتاب ''مطالعہ قرآن کا تعارف'' میں مزید کام کروں گا۔ مجوسی فکر اور مذہبی تجربہ نے مسلم دینیات، فلسفہ اور تصوف میں بہت زیادہ سرایت کی ہے واقعی یہ ثابت کرنے کے لیے شہادت موجود ہے کہ تصوف کے بہت سے مدارس جنھیں اب اسلامی کہا جاتا ہے نے صرف مجوسی نوعیت کا مذہبی تجربہ دہرایا ہے۔ میں مجوسی ثقافت کو انسانی ثقافت کی دوسری شکلوں میں سے ایک خیال کرتا ہوں۔ اور میں نے یہ اصطلاح بدنام کرنے کے لیے استعمال نہیں کی۔ اسکے فیصلہ کن نظریات تھے۔ اسکے فلسفیانہ مباحث اس کی سچائیاں اور خطائیں تھیں لیکن جب ایک ثقافت اپنے زوال کے آثار دکھانا شروع کر دیتی ہے تو اس کے فلسفیانہ مباحث اس کے نظریات اور مذہبی تجربہ کی شکلیں جامد اور غیر متحرک ہو جاتی ہیں۔ مجوسی ثقافت کی تاریخ میں اُس وقت ایسے ہی تھا جب اسلام ظاہر ہوا اور میرے ثقافتی تاریخ کے مطالعہ کے مطابق اُس ثقافت کے خلاف ایک شدید احتجاج میں شامل ہو گیا۔ یہ ظاہر کرنے کیلیے کہ اسلام نے فکر بلکہ مذہبی تجربہ کی بھی نئی راہیں کھلونے کا عزم کیا قرآن میں بذات خود قطعی ثبوت موجود ہے۔ تاہم ہمارے مجوسی ورثہ نے حیاتِ اسلام کا گلا گھونٹ دیا اور اسکی اصل روح اور عروج کی تمناؤں کو کبھی بڑھنے نہ دیا۔

۳۔ سٹیٹس مین کو ایک خط:۸

[سٹیٹس مین نے ڈاکٹر اقبال کا ''قادیانی اور صحیح العقیدہ مسلمان'' پر اپنا بیان پہلے ادارتی مقالہ میں تبصرہ کیساتھ شائع کیا۔ جواباً مندرجہ ذیل مضمون سٹیٹس مین کو لکھا گیا اور وہ ۱۰ جون ۱۹۳۵ء کو شائع کیا گیا]

میں اپنے بیان پر آپکے ناقدانہ ادارتی مقالہ جو ۱۴ مئی کے شمارہ میں شائع ہوا پر آپ کا بہت مشکور ہوں۔ جو سوال آپ نے ادارتی مقالہ میں اُٹھایا ہے بہت اہم ہے اور میں واقعی بہت خوش ہوں کہ آپ نے یہ سوال اُٹھایا ہے۔ میں نے یہ سوال اپنے بیان میں نہیں اُٹھایا تھا کیونکہ میں نے محسوس کیا تھا کہ قادیانیوں کی علیحدگی پسند پالیسی جس پر وہ مذہبی اور سماجی معاملات میں پختہ مزاجی کیساتھ اس وقت سے چل رہے ہیں جب سے اُن کے ہاں نبوت کی مخالف بنیادوں پر ایک نئی قوم استوار کرنے کا نظریہ پیدا ہوا اور اس تحریک کے خلاف مسلمانوں کے احساسات میں شدت پیدا ہوئی۔ یہ یقیناً حکومت کا فرض تھا کہ وہ ہندوستان کی مسلمان قوم کی طرف سے رسمی نمائندگی کا انتظار کیے بغیر مسلمانوں اور قادیانیوں کے مابین بنیادی اختلاف کے بارے میں انتظامی آگاہی حاصل کرے۔ سکھوں کے معاملہ کے بارے میں حکومتی رویہ سے جس نے ۱۹۱۹ء سے لاہور ہائی کورٹ جس کے عدالتی فیصلہ کے باوجود کہ سکھ ہندو (ہی) ہیں انتظامی طور پر علیحدہ سیاسی اکائی تصور نہیں کیا لیکن بعد ازاں سکھوں کی طرف سے کسی رسمی نمائندگی کے بغیر ہی اُنھیں علیحدہ سیاسی اکائی سمجھ لیا گیا مجھے ایسا محسوس کرنے کی حوصلہ افزائی کی گئی۔

تاہم اب آپ نے یہ سوال اُٹھایا ہے جس میں اب ایک ایسے معاملہ پر جسے میں انگریزوں اور مسلمانوں دونوں کے نکتۂ نظر سے بہت اہمیت والا خیال کرتا ہوں چند خیالات کا اظہار کروں گا۔ آپ مجھ سے چاہتے ہیں کہ میں مکمل طور پر واضح کر دوں کہ میں کب اور کہاں کسی طبقے کے مذہبی اختلاف کے سرکاری طور پر ادراک کو نظر انداز کر سکتا ہوں میں نشاندہی کرتا ہوں!

اول: یہ کہ اسلام لازماً ایک دینی قوم ہے جسکی حدود مکمل طور پر متعین ہوں۔ اللہ کی توحید پر ایمان تمام انبیاء پر ایمان اور (حضرت) محمد (ﷺ) کی ختم نبوت پر ایمان۔ آخر میں بیان کردہ عقیدہ درحقیقت ایسا عنصر ہے جو مسلمانوں اور غیر مسلموں میں حد بندی کرتا ہے اور یہ فیصلہ کرنے کا اہل کرتا ہے کہ کوئی فرد یا گروہ کسی قوم کا حصہ ہے یا نہیں مثلاً برہمو اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور وہ حضرت محمد (ﷺ) کو بھی اللہ کے انبیاء میں سے ایک مانتے ہیں پھر بھی اُن کو (اہل) اسلام کا لازمی جزو قرار نہیں دیا جا سکتا۔ کیونکہ وہ قادیانیوں کی طرح انبیاء کے ذریعے وحی کے تسلسل کے نظریہ پر ایمان رکھتے ہیں اور حضرت محمد (ﷺ) کی ختم نبوت پر ایمان نہیں رکھتے۔ جہاں تک مجھے علم ہے کسی اسلامی فرقہ نے حد بندی کی یہ لکیر کبھی عبور کرنے کی جرأت نہیں کی۔ ایران میں بہائیوں نے کھلم کھلا ختم نبوت کے اُصولوں کو مسترد کر دیا ہے۔ اور ساتھ ہی صاف طور پر انہوں نے تسلیم کر لیا ہے کہ وہ اب ایک نئی قوم ہیں۔ اور لفظ کے فنی مفہوم میں مسلمان نہیں ہیں۔ ہمارے عقیدہ کے مطابق اسلام اللہ کا نازل کردہ دین ہے لیکن اسلام کا ایک معاشرہ یا ایک قوم کے طور پر وجود پیغمبر پاک کی شخصیت پر منحصر ہے۔ میرے نکتہ نظر سے قادیانیوں کے لیے صرف دو راستے کھلے ہیں۔ بہائیوں کی پیروی کریں یا اس نظریہ کو اپنی تمام مضمرات کیساتھ قبول کرنے کے لیے بہائیوں کے اسلام کے عقیدہ ختم نبوت سے اس کی تمام تعبیرات (معنی دینا) کیساتھ پرہیز کریں ان کی زمانہ ساز تعبیرات محض اس خواہش کی پابند ہیں کہ وہ صرف واضح سیاسی مفاد کیلیے اسلام کے دائرہ میں رہنے کے خواہش مند ہیں۔

دوم: ہمیں دنیائے اسلام کے بارے میں قادیانیوں کے رویے اور ان کی اپنی پالیسی کو قطعاً نہیں بھولنا چاہیے۔ بانی تحریک نے قادیانیوں کو تنبیہ کرتے ہوئے کہ وہ مسلمانوں سے میل جول نہ رکھیں آبائی قوم (مسلمانوں) کو خراب دودھ اور اپنے پیروکاروں کو تازہ دودھ کہا تھا۔ مزید برآں اُن کا مبادیات (ایسی اہم باتیں جن کا شروع میں ہی جان لینا ضروری ہو) سے انکار اور اُن کا اپنے آپ کو ایک قوم کے طور پر نیا نام (احمدی) دینا اسلام کی با جماعت نمازوں میں عدم شمولیت اور شادی بیاہ وغیرہ کے معاملات میں اُن کی مسلمانوں سے لاتعلقی اور سب سے بڑھ کر اُن کا یہ اعلان کہ تمام دنیائے اسلام کافر ہے یہ سب کچھ قادیانیوں کا اپنی طرف سے واضح اعلانِ علیحدگی ہے۔ واقعی اُوپر بیان کردہ حقائق صاف طور پر ظاہر کرتے ہیں کہ قادیانی سکھوں کے ہندومت سے دوری کے مقابلے میں اسلام سے زیادہ دور ہیں کیونکہ سکھ ہندوؤں کو رشتے دیتے لیتے ہیں اگرچہ سکھ ہندو مندروں میں پوجا نہیں کرتے۔

سوم: یہ جاننے کیلیے کسی خاص ذہانت کی ضرورت نہیں کہ قادیانی دینی اور سماجی معاملات میں علیحدگی کی پالیسی پر چلتے ہوئے

سیاسی طور پر اسلام کے دائرہ میں رہنے کیلیے فکر مند ہیں سرکاری ملازمت کے میدان میں سیاسی فوائد سے ہٹ کر جو انہیں اسلام کے دائرہ میں رہ کر حاصل ہوتے ہیں۔ یہ واضح ہے کہ ان کی موجودہ آبادی کی رو سے جو آخری مردم شماری کے پیش نظر ۵۶ ہزار ہے وہ ملک کی کسی قانون ساز اسمبلی میں واحد نشست کے بھی اہل نہیں ہیں۔ لہذا اُنھیں اس مفہوم میں سیاسی اقلیت نہیں کہا جا سکتا جس مفہوم میں آپ اظہار کرتے رہتے ہیں۔ یہ حقیقت کہ قادیانیوں نے تاحال ایک الگ سیاسی اکائی کے طور پر علیحدگی کا مطالبہ نہیں کیا ظاہر کرتی ہے کہ وہ اپنی موجودہ حالت میں اپنے آپ کو قانون ساز اسمبلیوں میں کسی نمائندگی کے اہل نہیں پاتے۔ ایسی اقلیتوں کے تحفظ کے لیے نیا دستور اہتمام کے بغیر نہیں ہے۔ میرے خیال میں یہ واضح ہے کہ علیحدگی کے لیے حکومت تک رسائی کے معاملہ میں قادیانی کبھی اقدام نہیں کریں گے۔ مسلمان قوم قادیانیوں کی ان کی آبائی قوم سے علیحدگی کا مطالبہ کرنے میں حق بجانب ہے اگر حکومت فوری طور پر اس مطالبہ سے متفق نہیں ہوتی تو ہندوستانی مسلمان مجبوراً یہ شک کرنا شروع کر دیں گے کہ برطانوی حکومت نئے دین کو اسی حالت میں رکھنا چاہتی ہے اور علیحدگی میں تاخیر کر رہی ہے کیونکہ وابستگان کی قلیل تعداد کے پیش نظر یہ سر دست صوبے میں ایک چوتھی قوم کے طور پر روبہ عمل رہنے کے اہل نہیں جبکہ مقامی دستور میں پنجابی مسلمانوں کو جو پہلے ہی معمولی اکثریت میں ہیں موثر انداز میں نقصان پہنچائیں گے۔ ۱۹۱۹ء میں حکومت نے سکھوں کی علیحدگی کیلیے رسمی نمائندگی کا بھی انتظار نہیں کیا۔ اب اُنھیں (حکومت کو) قادیانیوں کی طرف سے رسمی نمائندگی کا کیوں انتظار کرنا چاہیے؟۔

۴۔ رومن دور حکمرانی میں یہود کی سالمیت:۹

[پندرہ روزہ ''اسلام'' کے نمائندہ خصوصی نے ڈاکٹر سر محمد اقبال سے پوچھا کہ کیا قادیان کے مرزا بشیر الدین محمود نے اپنے حالیہ خطاب جمعہ میں جو قادیانی مجلّہ ''طلوع آفتاب'' میں رپورٹ کیا گیا اُن کا نقطۂ نظر درج ذیل پیرا میں صحیح طریقے سے پیش کیا گیا ہے!

اُنھیں حکومت سے ایک شکایت ہے جب وہ کہتے ہیں کہ انگریز اتنے بھی عقلمند واقع نہیں ہوئے جتنے رومن دورِ مسیح میں تھے کیونکہ رومنوں نے آخر کار مسیح علیہ السلام کو مصلوب کر دیا۔ یہ رومنوں کی اُس کاروائی کو منظور کرنے کے سوا کچھ نہیں جب اُنھوں نے اپنی اتھارٹی کے تحت کاروائی کرنے کے بجائے یہودیوں کے مشتبہ پُر شور مطالبہ کا اثر قبول کرتے ہوئے مشروط طور پر اُن کے حوالے کر دیا۔

ہمارے نمائندہ خصوصی نے کہا کہ اُوپر کے پیرا میں الفاظ ''رومنوں کی کاروائی کو منظور کرنا'' کی طرف آپ کی خصوصی توجہ یہ دریافت کرنے کیلیے مبذول کراتا ہوں کہ کیا ایسا جملہ پیغمبر اسلام کی ختم نبوت پر آپ کے اس بیان میں موجود ہے جو کچھ عرصہ پیچھے ہندوستانی اور اینگلو ہندوستانی پریس میں شائع ہوا تھا۔ سر محمد اقبال نے فرمایا!]

یہ غلط انداز میں پیش کرنے کے قادیانی فن کی خاص مثال ہے۔ مرزا محمود میرے بیان میں ایک جملہ پڑھتے ہیں جسے وہ نقل نہیں کرتے اور جسے میں اپنے اس بیان میں نہیں پاسکا۔ معاملہ کی اصل یہ نظر آتی ہے کہ وہ اپنے مخصوص خیالات کے بارے میں تصور کرتے ہیں کہ وہ ایک خاص جملہ ہے۔ یہ واضح ہے کہ چونکہ اُن کے پاس میرے بیان کے مرکزی نکتہ کے خلاف کہنے کے لیے کچھ نہیں اُن کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے بے چارے پیروکاروں اور شاید حکومت کو بھی اس عقیدہ کے بارے میں دھوکہ دے سکیں کہ چونکہ میرا خیال ہے کہ رومنوں کے ماتحت یہودیوں کا تحفظ ہندوستان میں انگریزوں کے ماتحت مسلمانوں کے مقابلے میں بہتر طور پر کیا گیا۔ اس کے بعد یہ آتا ہے کہ میں یہودی مجلس کلیسا کے فیصلے کو رومن گورنر کا منظور کرنا ایک نیک عمل سمجھتا ہوں اسے بڑے غلط انداز میں پیش کرنے کی مثال تصور میں نہیں آسکتی۔ میرا ارادہ رومنوں کے بارے میں کوئی اخلاقی فیصلہ کرنے کا نہ ہوتا۔ میرے بیان نے صورت حال کا خالصتاً سیاسی جائزہ لیا تھا نا کہ اخلاقی نکتۂ نظر سے۔ نکتہ سارا یہ ہے کہ رومن خود کو دستوری طور پر یہودی مجلس کلیسا کے فیصلوں کو ان معاملات میں منظور کرنے کا پابند خیال کرتے تھے۔ یہودی جسے درست یا غلط طور پر اپنی سوسائٹی کے لیے خطرناک تصور کرتے تھے۔ خاص کر عیسیٰ (علیہ السلام) کے خلاف عدالتی کاروائی کے موقع پر یہ بدقسمتی تھی کہ رومنوں کو بطور ریاست یہودی مجلس کلیسا کا مطالبہ اس شخص کے بارے میں جو ہمارے عقیدہ کے مطابق ایک برحق نبی تھے ماننا پڑا۔ اگر یہ معاملہ کسی مذہبی مہم جو کا ہوتا تو کسی نے رومنوں کو کہ اُنہوں نے یہودی مجلس کلیسا کے فیصلہ کو منظور کر لیا یہودیوں کو مقدمہ چلانے کے مطالبہ پر اخلاقاً الزام نہ دیا ہوتا ذاتی طور پر میں اس دستوری تحفظ کی اہمیت سے انکار نہیں کرتا جو رومنوں نے یہودیوں کو دیا تھا۔ اگرچہ میں اس تحفظ کی اخلاقی قدر و قیمت کے بارے میں مختلف نکتہ نظر رکھتا ہوں۔ غالباً ایک دن قادیانی بذات خود اپنے باغی پیغمبروں کے خلاف تحفظ مانگیں گے جن کی پیدائش اور نشوونما کو قادیانیوں کے اسلامی دینی تصورات کو بازاری بنانے نے ممکن بنایا۔ کسی وقت بھی ان میں سے کوئی ایک کافی قوت جمع کر کے اپنے گروہ کی موجودہ تنظیم کے لیے خطرہ بن سکتا ہے۔ میرے نزدیک یہ حیران کن معاملہ ہے کہ ایک گروہ جس نے اپنی پیدائش اور نشوونما کے لیے جدید ریاست کی آزادروی پر مکمل انحصار کر لیا ہے مذہبی مہم جوؤں کیخلاف اسلام کے تحفظ کے لیے میرے مطالبہ پر ناراض ہو۔

قادیانی منطق دوبارہ میرے بیان میں تجویز دیکھتی ہے کہ انگریز قوت کو چاہیے تھا کہ قادیانی تحریک کو قوت سے دبا دے میں اپنے بیان میں مکمل طور پر واضح کر دیا ہے کہ دین میں عدم مداخلت کی پالیسی ہندوستان کے لیے ناگزیر ہے جو نمایاں طور پر دینی اقوام کا ملک ہے۔ میں آزاد خیالی کا مداح نہیں ہوں اور میں اسے خیالات کا ایسا مجموعہ گردانتا ہوں جو آدمی کو وہ بنانے کی طرف میلان رکھتا ہے جو اسے نہیں ہونا چاہیے۔ لیکن پھر بھی میں اُس (آزاد خیالی) کو جدید دنیا میں طاقتور قوت ہونے سے انکار نہیں کر سکتا۔ نظر آتا ہے کہ مرزا محمود یا تو لفظ ناگزیر کا مطلب نہیں جانتا یا بڑی آسانی سے اُسے یکسر نظر انداز کر

دیتا ہے۔

رومنوں نے عیسیٰ علیہ السلام اور اُن کے پیروکاروں کو ایک نئے دین والی قوم تسلیم کرلیا ہوگا لیکن یہودی معاشرے کو تحفظ دینے کا یہ طریقہ عیسائیوں کیلیے کھلا نہ تھا۔ کیونکہ جب یسوع علیہ السلام کو پیلاطس کے سامنے لایا گیا تو اس وقت ان کے پیروکار ساتھ نہ تھے۔ تاہم ہندوستان میں انگریزوں کیلیے راستہ کھلا ہے کہ وہ انتظامی طور پر قادیانیوں کو ایک جدا قوم تسلیم کرلیں میں دیانتداری کیساتھ مانتا ہوں کہ یہ امن کیلیے واحد راستہ ہے۔ قادیانیوں کو اس قوم کا لازمی جزو بننے کیلیے فکر مند نہیں ہونا چاہیے جس کو وہ کافر قوم خیال کرتے ہیں۔

۵۔ اسلام اور احمدیت:۱۰ل

پنڈت جواہر لال نہرو کے ماڈرن ریویو کلکتہ میں تین مضامین چھپنے پر مجھے مختلف مذہبی اور سیاسی نکتۂ نظر کے مسلمانوں کے بہت سے خطوط موصول ہوئے۔ ان خطوط کے بعض لکھاری مجھ سے چاہتے ہیں کہ میں مزید وضاحت کروں اور ہندوستانی مسلمانوں کے احمدیوں کے بارے میں رویہ کا جواز پیش کروں دوسرے مجھے کہتے ہیں کہ مختصراً بتادوں کہ مسئلہ احمدیت کے بارے میں میرا کیا خیال ہے؟۔ اس بیان میں میری پہلی تجویز یہ ہے کہ اُن کے مطالبات تسلیم کر لیے جائیں جنھیں میں بالکل جائز خیال کرتا ہوں بعدازاں پنڈت جواہر لال نہرو کے اُٹھائے گئے سوالات کا جواب دوں گا۔ تاہم مجھے ڈر ہے کہ اس بیان کے اجزا پنڈت جی کی دلچسپی کے نہیں ہوں گے۔ اور اُن کا وقت بچانے کے لیے اُنھیں مشورہ دیتا ہوں کہ ایسے اجزا سے آگے گزر جائیں۔

میرے لیے یہ کہنا بہت کم ضروری ہے کہ میں مشرق اور شاید دنیا بھر کے سب سے بڑے مسئلہ پر پنڈت جی کی دلچسپی کو خوش آمدید کہتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ وہ ہندوستان کے پہلے قوم پرست رہنما ہیں جنھوں نے عالم اسلام کی موجودہ روحانی بے چینی کو جاننے کے لیے خواہش کا اظہار کیا ہے۔ اس کے ممکنہ ردعمل اور بہت سے پہلوؤں کے پیش نظر ہندوستان کے اہل فکر سیاسی رہنما اس مسئلہ کے حقیقی فہم کے لیے جس نے دنیائے اسلام کو مبتلائے اضطراب کردیا ہے ذہن کھلا رکھیں۔

تاہم میں اس بیان کے کسی قاری یا پنڈت جی سے یہ حقیقت نہیں چھپانا چاہتا کہ پنڈت جی کے مضامین نے لمحہ بھر کے لیے احساسات کو قدرے تکلیف دہ الجھاؤ دیا ہے اُن کو وسیع ثقافتی ہمدردیوں کا حامل انسان جانتے ہوئے میرا ذہن اس نکتہ نظر کیطرف میلان رکھے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اُن کی خواہش کہ وہ اٹھائے گئے سوالات کو سمجھیں بالکل جائز ہے۔ پھر بھی جس انداز سے انہوں نے اپنا نکتہ نظر بیان کیا ایک نفسیاتی کیفیت کو افشا کررہا ہے جسے ان سے منسوب کرنے میں مشکل محسوس کرتا ہوں میرا میلان اس سوچ کیطرف ہے کہ قادیانیت الاپر میرے بیان نے جو جدید خطوط پر دینی عقیدہ کی تشریح سے زیادہ ہیں پنڈت جی اور قادیانیوں دونوں کو مشکل سے دوچار کردیا ہے دونوں اندر سے غصہ میں ہیں کیونکہ میرا بیان خصوصاً ہندوستان میں

مختلف وجوہات کی بنا پر مسلمانوں کے دینی اور سیاسی استحکام کے امکانات رکھتا ہے یہ بالکل واضح ہے کہ ہندوستانی قوم پرست جس کی سیاسی مثالیت (نہایت اعلیٰ قسم کے اوصاف و خیالات جو بطور مثال پیش کیے جا سکیں) نے شمال مغربی ہندوستانی اسلام (مسلمانوں) کے دل میں اپنے فیصلے خود کرنے کی خواہش کی پیدائش کا احساس در حقیقت عدم رواداری کی بنا پر عملاً ختم کر دیا ہے۔ میرے نکتہ نظر سے اسکی سوچ غلط ہے کہ ہندوستانی قومیت کے لیے ملک کے ثقافتی وجودوں کو باہمی تعامل (مل جل کر کام کرنا) کے ذریعے اسیر اور برداشت کا مادہ رکھنے والی ثقافت کے طور پر ترقی دے کر مکمل طور پر دبا دینے میں ہے۔ ان ہتھکنڈوں کے ذریعے حاصل کی گئی قومیت کا مطلب باہمی تلخیوں نیز تشدد کے سوا کچھ نہ ہوگا اسی طرح یہ بھی صاف ظاہر ہے کہ قادیانی بھی ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاسی بیداری وقار میں بلندی سے یقیناً عربی پیغمبر کی اُمت میں سے ہندوستانی پیغمبر کیلیے ایک نئی اُمت تراشنے کے اُن کے عزائم کو شکست ہوگی۔ میرے لیے یہ تھوڑے اچنبے کی بات نہیں کہ ہندوستانی مسلمانوں کو متاثر کرنے کی میری کوششیں جو ہندستان میں اُن کی تاریخ کے تشویشناک موقع پر اندرونی ربط کے لیے انتہائی اہم ہیں اور میرا اُن انتشار کی قوتوں اور اصلاحی تحریک کا روپ دھارنے والوں کو تنبیہ کرنے پر پنڈت جی ایسی قوتوں سے ہمدردی کریں۔

تاہم میں نہیں چاہتا کہ میں پنڈت جی کے محرکات کا تجزیہ کرنے کے ناخوشگوار کام کے پیچھے پڑا رہوں۔ اُن لوگوں کے فائدہ کے لیے جو عام مسلمانوں کے قادیانیوں کے خلاف رویہ کی تشریح چاہیں۔ میں ڈورنٹ کی کتاب "داستانِ فلسفہ" کا ایک پیرا نقل کروں گا مجھے اُمید ہے کہ قاری کو مسئلہ قادیانیت پر واضح سوچ دے گا۔ ڈورنٹ نے چند جملوں میں عظیم فلسفی سپینوزا سے یہودیوں کی معاشرتی لاتعلقی کا خلاصہ پیش کر دیا ہے۔ قاری ہرگز نہ سوچے کہ یہ پیرا نقل کر کے میرا مقصد بانی تحریک احمدیت اور سپینوزا میں کسی قسم کا تقابل کر کے طنز کرنا ہے۔ دونوں میں ذہانت اور کردار کے لحاظ سے انتہائی حیران کن دوری ہے۔ سرشارِ الٰہی سپینوزا نے کبھی بھی دعویٰ نہیں کیا کہ وہ کسی نئی تنظیم کا مرکز ہے اور یہ کہ وہ تمام یہودی جو اُس پر ایمان نہیں لاتے وہ یہودیت سے باہر ہیں۔ لہٰذا ڈورنٹ کا پیرا یہودیوں کے سپینوزا سے لاتعلقی کے رویہ کے مقابلے میں مسلمانوں کے قادیانیوں کیساتھ رویہ پر زوردار طریقہ سے منطبق ہوتا ہے۔ وہ پیرا یوں ہے۔

> "مزید برآں پادریوں کو ایمسٹرڈیم میں چھوٹے یہوودی گروپوں کو عدم استحکام سے بچانے کیلیے مذہبی اتفاق رائے ہی واحد ذریعہ نظر آتا ہے جو اُن کے اتحاد کو محفوظ رکھنے اور یوں دنیا میں بکھرے ہوئے یہودیوں کی بقاء یقینی بنانے کا آخری ذریعہ تھا۔ اگر اندرونی ربط اور بیرونی وقار قوت حاصل کرنے کے لیے غیر مذہبی اقتدار اور وسائل کی حامل ان کی اپنی ریاست ہوتی اپنا مدنی قانون (شہروں سے متعلق) ہوتا اور اپنے ادارے ہوتے تو وہ زیادہ

رواداری ہوتے مگر انکے نزدیک حب الوطنی اور اعتماد ان کا مذہب تھا معبد کی دینی مجلس اُنکی سماجی اور سیاسی زندگی اور مذہبی رسومات اور عبادت کا بھی مرکز تھی اور بائبل جسکی صداقت پر سپنوزا کو اعتراض تھا اپنی عوام کا سفری دیس تھی ان حالات میں انہوں نے نئی راہ اپنانے کو غداری اور رواداری کو خودکشی تصور کیا"۔

یہودی ایمسٹرڈیم میں ایک اقلیتی قوم کے طور پر رہ رہے تھے وہ سپنوزا کو جس سے ان کی قوم کے تحلیل ہو جانے کا ڈر تھا ایک عدم استحکام لانے والا عنصر خیال کرنے میں بالکل حق بجانب تھے۔ اُسی طرح ہندوستانی مسلمان قادیانی تحریک کو جو تمام دنیائے اسلام کو کافر قرار دیتے ہیں اور ان سے معاشرتی مقاطعہ کرتے ہیں سپنوزا کی مابعد الطبیعات (فلسفہ وغیرہ) سے یہودی اجتماعی زندگی کو لاحق خطرہ سے زیادہ خطرناک قرار دینے میں حق بجانب ہیں۔ میرا ایمان ہے کہ ہندوستانی مسلمان جبلی طور پر حالات کی اس مخصوص نوعیت کا احساس رکھتا ہے۔ ہندوستان میں جن حالات میں اُسے رکھا گیا ہے اور قدرتی طور پر کسی اور ملک کے مسلمانوں کے مقابلے میں عدم استحکام کی قوتوں کے بارے میں زیادہ حساس ہیں۔ میرے نکتہ نظر سے ایک اوسط درجے کے مسلمان کی یہ جبلی بصیرت بالکل درست ہے اور مجھے کوئی شک نہیں کہ ہندوستانی مسلمان کے شعور میں یہ بصیرت بہت گہری اساس رکھتی ہے۔ اس طرح کے معاملے میں رواداری کی باتیں کرنے والے لفظ رواداری کے استعمال کرنے میں جس کا مجھے ڈر ہے کہ اُسے قطعاً نہیں سمجھتے انتہائی بے پرواہیں۔ رواداری کا جذبہ انسان کے مختلف رجحانات سے اُبھر سکتا ہے جیسا کہ گبن کہتا ہے!

"ایک رواداری اس فلسفی کی ہوتی ہے جس کے نزدیک سارے مذاہب مساوی طور پر سچے ہیں۔ ایک رواداری اس مورخ کی ہوتی ہے جس کے نزدیک تمام مساوی طور پر غلط ہوتے ہیں۔ ایک رواداری اس سیاستدان کی ہوتی ہے جس کے نزدیک سب مساوی طور پر کام کرتے ہیں۔ ایک رواداری اس انسان کی ہوتی ہے جو فکر و عمل کے تمام طریقوں سے صرف نظر کرتا ہے کیونکہ وہ خود ان طور طریقوں سے بے نیاز ہوتا ہے ایک رواداری اس کمزور کی ہوتی ہے جو خودداری کی شدید کمزوری کی بنا پر پسندیدہ چیزوں اور اشخاص سے وابستہ ڈھیروں ذلت جیب میں ڈال لیتا ہے"۔

یہ بالکل واضح ہے کہ اس طرح کی تمام رواداریوں کی کوئی اخلاقی حیثیت نہیں اس کے برعکس یہ رواداریاں یقیناً اس انسان کے روحانی افلاس کا انکشاف کرتی ہیں جو یہ رواداریاں برتتا ہے۔ صحیح رواداری ذہنی اور روحانی وسعت کے ذریعے پیدا کی جاتی ہے۔ رواداری روحانی طور پر مضبوط انسان کی ہوتی ہے جو اپنے ایمان کی سرحدوں کے بارے میں غیرت مند ہوتے

ہوئے اپنے علاوہ دوسرے مذاہب والوں کے بھی تمام قسم کے عقائد کو برداشت کر سکتا ہے بلکہ ان کو سراہا بھی جا سکتا ہے اس طرح کی رواداری کا صرف سچا پکا مسلمان ہی اہل ہے۔ اس کا اپنا عقیدہ فکر کے مختلف زاویوں سے تشکیل پاتا ہے اس وجہ سے وہ بآسانی دوسروں کے عقائد سے ہمدردی اور ان کی ستائش کی بنیاد پالیتا ہے۔ ہمارا عظیم ہندوستانی شاعر امیر خسرو ایک بت پرست کے قصے میں خوبصورتی سے اس طرح کی رواداری کا جوہر واضح کرتا ہے۔ بت پرستوں کی بتوں کیساتھ شدید وابستگی کا جائزہ پیش کرنے کے بعد اپنے مسلمان قاریوں کو یوں خطاب کرتا ہے۔

اے کہ زبت طعنہ بہ ہندو بری　　　ہم زوئے آموز پرستش گری!۱۲

صرف ایک سچا محبِ الٰہی ہی جانثاری کی قدر و قیمت سراہا سکتا ہے اگر چہ اس کو ان دیوتاؤں کی طرف لے جایا جاتا ہے جنھیں وہ خود نہیں مانتا۔ ہمارے مبلغین رواداری کی حماقت اس آدمی کے رویے کی وضاحت پر مشتمل ہے جو اپنے غلط ایمان کی سرحدوں کے بارے میں ایک طرح کی عدم رواداری کے طور پر حمیت (غیرت) رکھتا ہے۔ وہ غلطی سے اس رویہ کو اخلاقی کمتری کی علامات خیال کرتے ہیں وہ نہیں سمجھتے کہ اس کے نکتہ نگاہ کی قدر و قیمت لازماً حیاتیاتی (حیات سے تعلق رکھنے والی) ہے جہاں کسی گروپ کے افراد جبلی طور پر یا منطقی دلیل کی بنیاد پر محسوس کرتے ہیں کہ ان کی اجتماعی سماجی تنظیم جس سے ان کا تعلق ہے خطرے میں ہے ان کے مدافعانہ رویہ کی قدر و قیمت کا اندازہ زیادہ تر ان کے حیاتیاتی معیار کے حوالے سے لگانا چاہیے۔ اس سلسلہ میں ہر فکر و عمل کی قدر و قیمت کا اندازہ زندگی سے متعلق اس معیار سے لگانا چاہیے جو معیار یہ فکر و عمل رکھتے ہیں۔ اس صورتِ احوال میں سوال یہ نہیں کہ کیا جس انسان کو کافر قرار دیا جائے اس کے خلاف کسی فرد جماعت کا (ایسا) رویہ اخلاقاً اچھا ہے یا برا۔ سوال یہ ہے کہ یہ (رویہ) حیات بخش ہے یا حیات تلف کرنے والا۔ پنڈت جواہر لال نہرو یہ سوچتے نظر آتے ہیں کہ ایک معاشرہ جس کی بنیاد دینی اصولوں پر اُٹھائی گئی ہو وہ سرکاری تحقیقاتی ادارہ ضروری قرار دیتا ہے تاریخ عیسائیت کی حد تک یہ واقعی درست ہے۔ لیکن پنڈت جی کے نکتہ نظر کے برعکس تاریخ اسلام ظاہر کرتی ہے کہ اسلامی زندگی کے پچھلے تیرہ سو سالوں میں مسلمان ممالک میں تحقیقاتی ادارے کا قیام بالکل انجانا رہا ہے۔ قرآن صریحاً ایسے تحقیقاتی ادارے کے قیام کو ممنوع قرار دیتا ہے۔ "دوسروں کی کمزوریوں کی ٹوہ نہ لگاتے پھرو اور نہ ہی اپنے بھائیوں کی غیبت کرتے رہو" ۱۳ واقعی پنڈت جی تاریخ اسلام سے معلوم کر لیں گے کہ یہود و نصاریٰ کو اپنے وطنوں میں مذہبی اذیت کے ہاتھوں بھاگنے پر ہمیشہ اسلامی ممالک میں پناہ ملی۔ دو مسئلے جن پر اسلام کا نظریاتی ڈھانچہ استوار ہے اس حد تک سیدھے سادہ ہیں کہ اس مفہوم کی بدعت جو بدعتی کو دائرہ اسلام سے خارج کر دے تقریباً ناممکن ہے۔ یہ درست ہے کہ جب کوئی شخص بدعتی نظریات رکھنے والا قرار دیا جائے تو موجود سماجی نظم کو خطرہ میں ڈال دیتا ہے۔ ایک آزاد مسلم ریاست ضرور کاروائی کرے گی۔

لیکن اس صورت میں ریاست کی کاروائی مذہبی کے بجائے خالصتاً سیاسی تاملات کے تحت ہوگی۔ مجھے بخوبی آگاہی

ہے کہ پنڈت جی کی طرح کوئی شخص جو ایسے معاشرہ میں پلا بڑھا ہو جس (معاشرہ) کی اچھی طرح طے شدہ حدود ہیں اور نتیجۂ داخلی پیوستگی بھی نہ ہو یہ سوچنے میں دقت محسوس کرتا ہے کہ ایک مذہبی معاشرہ لوگوں کے عقائد کے بارے میں ریاست کی طرف سے تحقیقاتی کمشن قائم کیے بغیر رہ سکتا ہے یہ کارڈینل نیومین سے ان کے نقل کیے گئے پیرا سے بالکل واضح ہے اور متعجب ہیں کہ میں کہاں تک کارڈینل کا مقولہ اسلام پر منطبق کروں گا۔ مجھے اجازت دیں کہ میں اُنھیں بتادوں کہ اسلام کے ڈھانچے اور کیتھولک مذہب کے مابین بہت بڑا فرق ہے۔ کیتھولک مذہب میں پیچیدگی ماورائے منطق کردار اور بہت سے عقائد جو عیسائیت کی تاریخ بتاتی ہے نے نئی کافرانہ تعبیرات کے امکان کو سینے سے لگائے رکھا ہے محمدیت کے سیدھے سادے عقیدہ کی بنیاد دو مسئلوں پر قائم ہے کہ اللہ ایک ہے اور حضرت محمد (ﷺ) نفوس قدسیہ کی قطار کے آخری فرد ہیں جو وقتاً فوقتاً انسانیت کو زندگی گزارنے کے درست طریقوں کی رہنمائی کرنے کیلیے تمام ادوار اور تمام ممالک میں ظہور پذیر ہوتے رہے ہیں۔ اگرچہ جیسے کہ کچھ عیسائی لکھاری خیال کرتے ہیں کہ کسی عقیدہ کی تعریف ماورائے منطق (جہاں دلیل یا گفتگو کام نہ دے سکے) مسئلہ کے طور پر کی جائے جسے مذہبی استحکام کے حصول کیلیے اسکا مابعد الطبیعاتی مفہوم جانے بغیر مان لیا جائے پھر تو اسلام کے ان دو سادہ سے مسائل کی بھی بطور عقیدہ وضاحت نہیں کی جاسکتی۔ کیونکہ دونوں کو انسانی تجربہ کی حمایت حاصل ہے اور بخوبی منطقی استدلال ماننے کے قابل ہیں۔ کفر کا سوال جسے فتویٰ درکار ہوتا ہے کہ کیا اس کا بانی دائرہ اسلام میں ہے یا دائرہ اسلام سے خارج ہے اس وقت پیدا ہوتا ہے اگر کوئی دینی معاشرہ جس کی بنیاد ان دو مسئلوں پر رکھی گئی ہو (اور) فقط جب بدعتی ان دونوں مسئلوں یا دونوں میں سے کسی ایک کو مسترد کر دے۔ اس طرح کا کفر و بدعت تاریخ اسلام میں شاذ و نادر ہی ہوا ہے۔ جبکہ اس کی سرحدوں سے بدگمان اس کی سرحدوں میں آزادئ تعبیر کی اجازت دیتا ہے اور چونکہ اس طرح کفر و بدعت جو اسلام کی سرحدوں کو متاثر کرتی ہے کا مظہر تاریخ اسلام میں کم کم رہا ہے۔ اسی لیے جب اس طرح کی بغاوت اُبھرتی ہے تو اوسط سطح کے مسلمان کا احساس قدرتی طور پر شدید ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ مسلم فارس کا بہائیوں کے خلاف احساس اتنا شدید تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کا قادیانیوں کے خلاف احساس اس قدر شدید ہے۔

یہ درست ہے کہ مسلمان مذہبی فرقوں میں معمولی نوعیت کے دینیاتی اور فقہی اختلافات پر کفر و بدعت کا الزام لگانا قدرے عام ہے۔ چھوٹے چھوٹے دینیاتی نکات اور انتہائی کفریہ صورتوں میں لفظ کفر کے اس بلا امتیاز استعمال میں جن میں کافر سے معاشرتی مقاطعہ شامل ہو جاتا ہے کچھ ان دونوں کے تعلیم یافتہ مسلمان جن کو مسلم دینیاتی تنازعات کا کوئی عملی علم نہیں ہوتا مسلم قوم میں سماجی اور سیاسی انتشار کی علامات دیکھتے ہیں تاہم یہ ایک انتہائی غلط خیال ہے۔ مسلم دینیات کی تاریخ ظاہر کرتی ہے کہ چھوٹے چھوٹے اختلافی نکات پر کفر و بدعت کے باہمی الزامات نے ایک انتشار پرور قوت کے طور پر کام کرنے سے دور رہ کر در حقیقت امتزاجی (ہر اچھی بات کو اہمیت دینا) دینیاتی فکر کو تحریک دی ہے۔ پروفیسر برگرانجے کہتا ہے! جب

محمدی قانون کے ارتقاء کی تاریخ پڑھتے ہیں تو ہم دیکھتے ہین کہ ایک طرف ہر دور کے فقہاء خفیف ترین محرک پر ایک دوسرے کو کفر و بدعت کے باہمی الزامات کی حد تک برا بھلا کہتے ہیں اور دوسری طرف بالکل وہی لوگ اتحاد مقصد کے بڑے بڑے اتفاق کیساتھ اپنے پیش روؤں کے اسی نوعیت کے جھگڑوں میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

مسلم دینیات کا طالب علم جانتا ہے کہ مسلم ماہرین قانون کے ہاں اس نوعیت کی بدعت کو فنی طور پر بدعت سے نچلے درجے کی بدعت جانا جاتا ہے یعنی اس نوعیت کی بدعت جس میں مجرم کا (دین سے) اخراج شامل نہیں۔ تاہم یہ تسلیم کرلیا جائے کہ ملاؤں کے ہاتھوں جن کی ذہنی سست روی تمام طرح کے اختلافات کو حرفِ آخر سمجھتی ہے اور نتیجۂ اختلاف میں اتحاد سے نابلد ہے یہ چھوٹی سی بدعت بڑے بڑے فساد کا منبع بن سکتی ہے۔ اس فساد کا تدارک اپنے دینیاتی مکاتیبِ فکر کے طلباء اسلام کی احتزاجی روح کی نسبتاً بہتر بصیرت اوران کو نئے سرے سے منطقی تضاد کی کارگزاری کو دینیاتی جدلیات میں اصول تحریک کے طور پر شروع کر کے کیا جاسکتا ہے۔ بڑی بدعت (کفر) کہنے کا سوال صرف اُس وقت پیدا ہوتا ہے جب کسی مفکر یا مصلح کی تعلیم اسلام کی اعتقادی سرحدوں کو متاثر کردے۔ بدقسمتی سے قادیانیت کی تعلیمات کے سلسلہ میں یہ سوال اُبھرتا ہے۔ یہاں یہ نشاندہی ضرور کردی جائے کہ احمدی تحریک دوحصوں میں منقسم ہے جنھیں قادیانی اور لاہوری کے طور پر جانا جاتا ہے اول الذکر کھلم کھلا بانی تحریک کو مکمل نبی مانتے ہیں موخرالذکر نے ایمان یا پالیسی کے طور پر قدرے نرم سی قادیانیت کی تبلیغ کرنا قرین مصلحت پایا ہے۔ تاہم یہ سوال کہ کیا قادیانیت کا بانی نبی تھا جس کے مشن کے انکار کا لازمی نتیجہ وہ ہوتا ہے جسے میں بڑی بدعت کا نام دیتا ہوں، فریقین کے مابین متنازعہ معاملہ ہے احمدیوں کے اس اندرونی مباحثہ کے استحقاق کا فیصلہ کرنا میرے مقاصد کیلیے غیر ضروری ہے میں ان وجوہات کی بنا پر جو ابھی واضح کی جائیں گی اعتقاد رکھتا ہوں کہ کسی مکمل نبی کا تصور جس کے انکار کا لازمی نتیجہ اسلام سے نکل جانا ہوتا ہے احمدیت کا جزو لازم ہے اور قادیانیوں کا موجودہ سربراہ لاہوریوں کے امام کی نسبت روح تحریک سے زیادہ مطابقت رکھتا ہے۔

میں نے اسلام میں عقیدہ ختم نبوت کی ثقافتی قدر و قیمت کسی اور جگہ پوری طرح واضح کی ہے اس کا مفہوم عام فہم ہے محمد ﷺ جنھوں نے ایک قانون دیکر جو انسانی شعور کی انتہائی گہرائی سے لے لینے کے قابل ہے اپنے پیروکاروں کی گلوخلاصی کرائی ہے کے بعد کسی انسان کے سامنے روحانی دست برداری نہیں۔ دینیاتی طور پر نظریہ یہ ہے کہ وہ سماجی تنظیم جو اسلام کہلاتی ہے مکمل اور دائمی ہے حضرت محمد ﷺ کے بعد کوئی ایسی وحی ممکن نہیں جس کا انکار کفر ہو جو ایسی وحی کا دعویٰ کرتا ہے غدار اسلام ہے چونکہ قادیانیوں کا ایمان ہے کہ بانی تحریک احمدیہ ایسی وحی کا حامل ہے وہ اعلان کرتے ہیں کہ تمام دنیائے اسلام کافر ہے۔ بانی کا اپنا استدلال جو قرون مظلمہ کے ماہر دینیات کے شایانِ شان ہے کہ اگر اسلام کے پیغمبر اقدس کی نئی پیدا کرنے والی روحانیت کا ثبوت ہے لیکن اگر آپ اس سے پوچھیں کہ کیا محمد (ﷺ) کی روحانیت ایک سے زیادہ انبیاء تخلیق کرسکتی ہے؟ اسکا

جواب نہیں میں ہے۔دراصل اسکا یہ معنی ہے کہ محمدﷺ آخری نبی نہیں ہیں۔تاریخ انسانیت میں بالعموم اور ایشیاء میں اس مفہوم میں کہ محمدﷺ کا کوئی پیروکار کبھی بھی منصب نبوت تک نہیں پہنچ سکتا محمدﷺ کی نبوت ناقص ہونے کی علامت ہے۔جیسے کہ میں اسکی ذہنی نفسیات پڑھتا ہوں وہ اپنی نبوت کے دعویٰ کی دلچسپی میں اُس سے فائدہ اٹھاتا ہے جسے وہ اسلام کے پیغمبر اقدس کی تخلیقی صلاحیت بیان کرتا ہے اور عین اُسی وقت پیغمبر پاک کی روحانیت کی تخلیقی صلاحیت کو صرف ایک نبی یعنی احمدیہ تحریک کے بانی تک محدود کر کے ان کو ختم نبوت سے محروم کرتا ہے۔اس طرح نیا نبی خاموشی سے اُن کی ختم نبوت چرا لیتا ہے جن کو اپنا روحانی جدامجد ہونے کا دعویٰ دار ہے۔

وہ اسلام کے پیغمبر پاک کا بروز ہونے کا مدعی ہے۔بروز ہوتے ہوئے آہستہ آہستہ یہاں تک پہنچ جاتا ہے کہ درحقیقت اسکی ختم نبوت محمدﷺ کی ختم نبوت ہے لہذا معاملہ کا یہ نکتہ نظر پیغمبر پاک کی ختم نبوت کی خلاف ورزی نہیں کرتا۔دو ختم نبوتوں اپنی اور پیغمبر پاک کی کو متعارف کراتے ہوئے وہ نظریہ ختم نبوت کے زمانی مفہوم سے نا آشنا ہو جاتا ہے تاہم یہ واضح ہے کہ لفظ بروز مکمل مشابہت کے مفہوم میں بھی قطعاً اسکی مدد نہیں کر سکتا کیونکہ بروز ہمیشہ اصل کی دوسری سمت رہتا ہے صرف تجسیم نو (کسی نئے جسم میں آنا) کے مفہوم میں ہی ایک بروز اصل کا سا ہوتا ہے یوں اگر ہم لفظ بروز سے مراد روحانی صفات میں ملنا جلنا لیں تو دلیل بے اثر رہتی ہے۔اسکے برعکس اگر ہم اس سے مراد لفظ کے آریائی مفہوم میں اصل کی تجسیم نو مراد لیں تو استدلال بظاہر معقول ہوتا ہے لیکن اسکا مصنف مجوسی بھیس میں ظاہر ہوتا ہے۔

سپین کے عظیم مسلمان صوفی محی الدین ابن عربی کی سند پر یہ مزید دعویٰ کیا گیا ہے کہ ایک مسلمان ولی کیلیے اسکے روحانی ارتقاء میں ممکن ہو جاتا ہے کہ پیغمبرانہ شعور کے وصف کی قسم کا تجربہ کرے۔میں ذاتی طور پر شیخ محی الدین ابن عربی کا نکتہ نظر نفسیات کی رو سے مبالغہ آمیز سمجھتا ہوں لیکن اُسے درست فرض کرتے ہوئے میرا خیال ہے کہ قادیانی استدلال اُن کے اصل موقف کی مکمل غلط فہمی پر مبنی ہے۔شیخ اسکو خالصتاً ذاتی کامیابی خیال کرتے ہیں جو معاملات کی نوعیت کے تحت ایسے کسی ولی کو نہ حق دیتا ہے نہ دے سکتا ہے کہ وہ اعلان کرے کہ جو اس پر ایمان نہیں لاتا دائرہ اسلام سے خارج ہے دراصل شیخ کے نکتہ نظر کے مطابق ہو سکتا ہے کہ ایک ہی دور یا ایک ہی املاک میں ایک سے زیادہ ولی ہوں جو پیغمبرانہ شعور حاصل کر لیں۔مضبوطی سے پکڑنے کا نکتہ یہ ہے کہ جبکہ کسی ولی کیلیے نفسیاتی طور پر پیغمبرانہ تجربہ حاصل کرنا ممکن ہے اسکے تجربہ کی کوئی سیاسی و سماجی حیثیت نہیں ہوگی جو اُسے کسی نئی تنظیم کا مرکز بنادے اور اُسے حق دے کہ وہ اس تنظیم کو محمدﷺ کے پیروکاروں کیلیے ایمان و کفر کا معیار بنادے اس صوفیانہ نفسیات کو ایک طرف رکھتے ہوئے میں فتوحات کے متعلقہ صفحات کا مطالعہ کرنے کے بعد قائل ہو گیا ہوں کہ عظیم سپینی صوفی محمدﷺ کی ختم نبوت پر اتنا محکم ایمان رکھتے ہیں جتنا کوئی صحیح العقیدہ مسلمان اور اگر وہ اپنے صوفیانہ مکاشفے میں دیکھ لیتے کہ ایک دن مشرق میں تصوف میں کوئی ہندوستانی اناڑی اپنی صوفیانہ نفسیات کے تحت پیغمبرﷺ کی ختم نبوت کو

تلف کرنے کا متلاشی ہوگا تو وہ یقیناً ایسے غدارانِ اسلام کے خلاف دنیائے اسلام کو تنبیہ کرکے ہندوستانی علماء کی پیش بندی کر لیتے۔

حصہ دوم

اب احمدیت کی اصل کی طرف آتے ہیں۔ اسکے ماخذات اور جس انداز سے قبل از اسلام کے مجوسی نظریات نے اسلامی تصوف کی وساطت سے اسکے مصنف کے ذہن پر کام کیا ہے تقابل مذہب کے نکتہ نظر سے انتہائی دلچسپ ہوگا۔ تاہم میرے لیے ناممکن ہے کہ میں یہاں زیر بحث لاؤں۔ یہ کہنا کافی ہے کہ احمدیت کی اصل نوعیت قرون مظلمہ کے تصوف اور دینیات کی دھند کے پیچھے مستور ہے۔ اسی لیے ہندوستانی علماء نے اسے خالصتاً دینی تحریک کے طور پر لیا اور اس سے نبٹنے کے لیے دینی ہتھیار لیکر نکلے۔ تاہم مجھے یقین ہے کہ تحریک سے نبٹنے کیلیے یہ صحیح طریقہ نہیں تھا۔ اسی لیے علماء کی کامیابی صرف جزوی تھی۔ بانی تحریک کی مبینہ (بیان کی گئی) وحیوں کا محتاط نفسیاتی تجزیہ اسکی شخصیت کی باطنی زندگی کی تشریح کیلیے شاید موثر طریقہ ہوگا۔ اس سلسلہ میں میں مولوی منظور الٰہی کے بانی تحریک کی وحیوں کا ذکر کروں گا جو نفسیاتی تحقیق کیلیے بھرپور اور قسم قسم کا مواد پیش کرتی ہیں۔ میری رائے میں کتاب بانی تحریک کے کردار اور شخصیت کیلیے کنجی ہے اور میں اُمید کرتا ہوں کہ ایک دن جدید نفسیات کا کوئی نوجوان طالب علم اس کا سنجیدہ مطالعہ شروع کر دے گا۔ اگر وہ قرآن کو اپنے معیار کے طور پر لے گا جیسا کہ اسکو ضرور اُن اسباب کی بنا پر کرنا چاہیے جن کی وضاحت یہاں نہیں کی جا سکتی اور وہ بانی تحریک احمدیہ کے تجربات اور ہم عصر غیر مسلم تصوف مثلاً بنگال کے راما کرشنا کے تقابلی جائزہ تک اپنے مطالعہ کو وسعت دے گا تو اُسے یقیناً اُس تجربہ کی لازمی صفت کے طور پر جس کی بنیاد پر احمدیت کے بانی کے لیے نبوت کا دعویٰ کیا گیا ہے ایک سے زیادہ الجھنوں سے واسطہ پڑے گا۔

ایک سادہ سے آدمی کے نکتہ نظر سے اُسی طرح کا موثر اور مفید طریقہ کم از کم ۱۷۹۹ء ہندوستان مسلم دینیات کی تاریخ کی روشنی میں احمدیت کے حقیقی مافیہ کو سمجھنا ہے۔ دنیائے اسلام کی تاریخ میں ۱۷۹۹ء انتہائی اہم ہے۔ اس سال ٹیپو شہید ہوئے اور اُن کی شہادت کا مطلب ہندوستان میں سیاسی وقار کی مسلم اُمیدوں کا خاتمہ تھا۔ اُسی سال جنگ نواریولڑی گئی جس نے ترکی بیڑہ کی تباہی دیکھی۔ ٹیپو کی تاریخ شہادت کے کتبہ جسے مزار ٹیپو کے زائرین دیواروں پر کندہ پاتے ہیں کے الفاظ پیشن گوئی پر مبنی تھے۔ جانے والا عظمتِ ہندوستان وروم ہے۔ یوں ۱۷۹۹ء میں ایشیاء میں اسلام کا سیاسی زوال اپنے عروج تک پہنچ گیا لیکن بالکل اُسی طرح جیسے یوم جینا پر جرمنی کی تذلیل میں سے نئی جرمن قوم اُبھری اُسی طرح کی سچائی کیساتھ کہا جاسکتا ہے کہ سال ۱۷۹۹ء میں اسلام کی سیاسی تذلیل کے بعد جدید اسلام اور اُس کے مسائل اُبھرے میں اس نکتہ کی وضاحت مضمون کے تکملہ میں کروں گا۔ اس وقت میں قاری کی توجہ کچھ سوالات کی طرف مبذول کرانا چاہتا ہوں جو ۱۷۹۹ء میں ٹیپو کی شہادت اور ایشیاء میں پوری سامراجیت کی نشوونما کے وقت سے مسلم انڈیا میں سامنے آئے کیا اسلام میں خلافت کا قیام قطعی طور پر مذہبا

شامل ہے۔کس طرح ہندوستانی مسلمان اور جہاں تک اس نظریہ خلافت کا معاملہ ہے ترکی ریاست سے باہر کے تمام مسلمان خلافت ترکیہ سے تعلق رکھتے ہیں۔کیا ہندوستان دارالحرب ہے یا دارالسلام ہے۔اسلام میں نظریہ جہاد کا حقیقی مفہوم کیا ہے۔قرآنی آیت ''اللہ کی اطاعت،رسول کی اطاعت کرواور اُن اہل امر کی (یعنی حکمرانوں کی) جوتم میں سے ہوں''۔ ۱۲ میں تم میں سے کلمات کا مفہوم کیا ہے؟۔نبی پاک کی ان احادیث کا جو ظہورامام مہدی کی پیشن گوئی کرتی ہیں(اصول روایت کی روشنی میں)مرتبہ کیا ہے؟۔یہ سوالات اور بعض دوسرے جو نتیجے پیدا ہوئے جن کے اسباب صاف ظاہر ہیں صرف ہندوستانی مسلمانوں کیلیے سوالات تھے۔یورپی سامراجیت جو تیزی سے دنیائے اسلام میں سرایت کررہی تھی۔بڑے قریب سے ان سوالات میں دلچسپی لے رہی تھی۔ان سوالات کے پیدا کیے ہوئے مباحث ہندوستان میں تاریخ اسلام کا ایک بہت دلچسپ باب بناتے ہیں۔داستان طویل ہے اور ہنوز کسی طاقتور قلم کی منتظر ہے۔مسلمان سیاستدان جن کی نگاہیں بڑی حد تک صورت حال کے ان حقائق پر مرکوز تھیں علماء کے ایک گروہ کو ہموا بنانے میں کامیاب ہوئے کہ مذہبی استدلال کی ایسی راہ اختیار کریں جیسے مسلمان سیاستدانوں نے سوچا کہ صورت حال کے مناسب تھی لیکن جس عقیدہ نے صدیوں سے ہندوستان میں عوام کے شعور پر حکمرانی کی تھی اس کو محض منطق کے زور پر سرنگوں کرنا آسان نہ تھا۔ایسی صورت حال میں منطق سیاسی مصلحت کی بنا پر یا متون اوراحادیث کو نئے رخ پر ڈال کر آگے بڑھتی دونوں حالتوں میں استدلال عوام الناس کو متاثر کرنے میں ناکام ہو جاتا ۔اسلام کے مضبوط مذہبی عوام الناس کو صرف ایک چیز فیصلہ کن حد تک متاثر کرتی اور وہ ہے خدائی اختیار۔پختہ عقائد کے موثر استعمال کے لیے ضروری پایا گیا کہ وحی پر مبنی بنیادیں تلاش کر لی جائیں۔سیاسی طور پر دینی عقائد میں پائے جانے والے سوالات جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے کو مناسب طریقے سے نئے رخ پر ڈالیں یہ وحی پر مبنی بنیاد احمدیت کے ذریعے مہیا کی گئی ہے اوراحمدی بذات خود دعویٰ کرتے ہیں کہ انہوں نے برطانوی سامراجیت کی سب سے بڑی خدمت کی ہے سیاسی اہمیت کے حامل دینی خیالات کیلیے وحی پر مبنی پیغمبرانہ دعویٰ اس اعلان کے مترادف ہے کہ جولوگ مدعی کے خیالات قبول نہیں کرتے پکے کافر ہیں اوراُن کا مقدر جہنم کے شعلے ہیں۔جہاں تک میں تحریک کی اہمیت سمجھتا ہوں احمدیوں کا عقیدہ ہے کہ مسیح ایک عام فانی انسان کی موت مرے اوراُن کے دوسرے ظہور کا مطلب صرف یہ ہے کہ ایک ایسے آدمی کا ظہور جو روحانی طور پر اُنکی طرح ہے۔تحریک کو کسی قدر ایک منطقی شکل وشباہت بخشتا ہے لیکن حقیقتاً وہ روح تحریک کیلیے لازمی نہیں ہے۔میرے خیال میں ایک مکمل نبوت کیلیے وہ صرف ابتدائی اقدامات ہیں جو اکیلے اُن مقاصد تحریک کے کام آسکتے ہیں جس تحریک کو بالآخرنئی سیاسی قوتیں وجود میں لائیں گی۔فرسودہ خیالات کے ممالک کیلیے یہ کوئی استدلال نہیں بلکہ دلکش سند ہے۔کافی زیادہ جہالت اورخوش اعتقادی کا عادی جو حیران کن طور پر بعض دفعہ اچھی ذہانت کیساتھ ساتھ ہوتا ہےاورایک آدمی جو کافی دلیر بھی ہو یہ اعلان کرنے میں کہ وہ خدائی وحی کا وصول کنندہ ہے جس کے انکار کا قدرتی نتیجہ دائمی عذاب ہوایک غلام مسلمان ملک میں نئی سیاسی دینیات

ایجاد کرنے کے لیے اور ایک ایسا طبقہ کھڑا کرنے کے لیے جس کا عقیدہ غلامانہ کمینگی ہو آسان سی بات ہے اور پنجاب میں مبہم دینی بیانات کا کمزور بنا ہوا جال بھی آسانی سے معصوم دہقانوں کو قابو کر سکتا ہے جو صدیوں سے ہر قسم کے ناجائز انتفاع (فائدہ اٹھانا) کی مصیبت میں ڈالے جاتے رہے ہیں۔ پنڈت جواہر لال نہرو تمام مذہبوں کے صحیح العقیدہ پیروکاروں کو متحد ہونے اور یوں جسے وہ ہندوستانی قومیت خیال کرتے ہیں کے آنے میں دیر کر سکیں۔ یہ طنزیہ مشورہ احمدیت کو ایک اصلاحی تحریک کے طور پر ظاہر کرتا ہے۔ پنڈت جی نہیں جانتے کہ جہاں تک ہندوستان میں اسلام کا تعلق ہے احمدیت مذہبی اور سیاسی دونوں طرح کے نہایت بلند اہمیت کے مسائل میں دخل اندازی کرتی ہے جیسے کہ میں نے اوپر واضح کیا ہے کہ مسلم دینی او کار کی تاریخ میں احمدیت کی کارگزاری ہندوستان کی موجودہ سیاسی غلامی کیلیے وحی پر مبنی بنیادیں پیش کرنا ہے۔ خالص دینی معاملات کو ایک طرف رکھتے ہوئے صرف سیاسی مسائل کی بنیاد پر میرا خیال ہے کہ پنڈت جواہر لال نہرو کی طرح کے آدمی کے منہ سے زیب نہیں دیتا کہ وہ ہندوستانی مسلمانوں کو رجعت پسندانہ قدامت پسندی کا الزام دیں مجھے کوئی شک نہیں کہ وہ اگر احمدیت کی اصل نوعیت کو سمجھ لیتے ہیں تو وہ ہندوستانی مسلمانوں کے رویہ کو ایک مذہبی تحریک کیساتھ جو ہندستان کے دکھوں کے لیے خدائی اختیار کا دعویٰ کرتی ہے بہت زیادہ سراہتے۔

اس طرح قاری دیکھ لے گا کہ احمدیت کے بے رونقی جسے ہم آج ہندوستانی اسلام کے چہرے پر دیکھتے ہیں ہندوستان کے لیے دینی افکار کی تاریخ میں اچانک ظاہر ہونے والا عجیب وغریب واقعہ نہیں جن نظریات نے بالآخر اس تحریک کی شکل اختیار کی وہ تحریک احمدیہ کے بانی کی پیدائش سے بھی بہت پہلے دینی مباحث میں نمایاں مقام حاصل کر چکے تھے۔ میرا مقصد نہ طنز کرنا ہے کہ بانی احمدیت اور اس کے رفقاء نے جان بوجھ کر اس پروگرام کی منصوبہ بندی کی۔ میں یہ کہنے کی جسارت کرتا ہوں کہ تحریک احمدیہ کے بانی نے ایک صدا سنی لیکن کیا یہ صدا قوت وحیات کے خالق سے آئی تھی یا لوگوں کے روحانی افلاس سے ابھری تھی لازماً تحریک اور ان افکار وجذبات کی نوعیت پر منحصر ہے جو اس نے اپنے سامعین کو دیے ہیں قاری کو قطعاً یہ نہیں سوچنا چاہیے کہ میں استعاراتی (علامات والا یعنی علامتوں میں بات کرنا) زبان استعمال کر رہا ہوں۔ اقوام کی داستان حیات ظاہر کرتی ہے کہ جب کسی قوم میں زندگی کا جوار بھاٹا اترنا شروع کرتا ہے تو زوال بذاتِ خود تحریک کا ذریعہ بن جاتا ہے جو اس کے شعراء، فلاسفہ، اولیاء و سیاستدانوں کو تحریک دیتا ہے اور انھیں داعیوں کی ایک ایسی جماعت میں تبدیل کر کے جس کا واحد منصب اس کے دلکش فنِ منطق کے ذریعے اُس سب کو جو اُن لوگوں کے نزدیک عمر بھر گھٹیا اور قابل نفرت ہوتا ہے ناموری عطا کرتا ہے وہ داعی غیر شعوری طور پر روایتی اقدار کی جڑیں کھوکھلی کر کے درخشاں امیدوں کو مایوسیاں پہنا دیتے ہیں اور یوں اپنے شکار بننے والوں کے روحانی جوش کو تباہ کر دیتے ہیں۔ اُن لوگوں کی خستہ حالت کا تصور کیا جا سکتا ہے جن کو خدائی سند کی بنیادوں پر اپنے سیاسی ماحول کو حرفِ آخر کے طور پر قبول کرنے کیلیے مجبور کر دیا جاتا ہے میرا خیال ہے کہ یوں وہ تمام اداکار

جنھوں نے احمدیت کے ڈرامے میں حصہ لیا زوال کے ہاتھوں میں معصوم آلہ کار تھے۔اسی طرح کے ڈرامے کی اداکاری پہلے ہی ایران میں کی گئی تھی۔لیکن اُس ڈرامے نے تمام دینی اور سیاسی معاملات میں قیادت نہیں کی اور نہ وہ کرسکتا تھا جو احمدیت نے ہندوستان میں اسلام کیلیے پیدا کیے۔روس نے بابیت کو برداشت کیا اور بابیوں عشق آباد میں پہلا تبلیغی مرکز کھولنے کی اجازت دی انگلستان نے ووکنگ میں اُنھیں اپنا پہلا تبلیغی مرکز کھولنے کی اجازت دیتے ہوئے احمدیوں کیساتھ ویسی ہی برداشت کا مظاہرہ کیا۔آیا روس اور انگلستان نے سامراجی مصلحت کی بنا پر خالصتاً فراخدلی سے رواداری کا مظاہرہ کیا۔ہمارے لیے فیصلہ کرنا مشکل ہے۔بالکل واضح ہے کہ اس رواداری نے ایشیا میں اسلام کیلیے مشکل مسائل کھڑے کیے۔اسلام کے ڈھانچے کے پیش نظر میرے ذہن میں زرہ برابر بھی شک نہیں کہ اسلام اپنے لیے پیدا کی گئی مشکلات میں سے مزید کندن بن کر نکلے گا حالات بدل رہے ہیں ہندوستان میں معاملات نے پہلے ہی ایک نیا رخ اختیار کیا ہے۔ہندوستان میں جمہوریت کیلیے آنے والا نیا جذبہ یقیناً احمدیوں کا طلسم توڑ دے گا اور اُنھیں اپنی دینی اختراعات کی یقینی فضولیت کے بارے میں قائل کر لے گا۔

نہ ہی اسلام قرون مظلمہ کے تصوف کے احیاء کو نظر انداز کرے گا جس نے پہلے ہی اپنے پیروکاروں کی صحت مند جبلت کو لوٹ لیا ہے اور اس کے بدلے میں صرف دھندلی سی سوچ دے دی ہے۔گزشتہ صدیوں کے دوران میں اس تصوف نے اسلام کے بہترین دماغوں کو ملکی معاملات معمولی درجے کے لوگوں کیلیے چھوڑتے ہوئے جذب کر لیا ہے۔جدید اسلام برداشت نہیں کرسکتا کہ اس تجربہ کو دہرایا جائے اور نہ یہ برداشت کرسکتا ہے کہ ڈیڑھ سو سال تک پنجاب کو اُن دینیاتی مسائل میں الجھائے رکھنے کے تجربہ کو دہرایا جائے جن مسائل کا زندگی سے قطعاً کوئی تعلق نہیں۔اسلام سے پہلے ہی تازہ فکر و عمل کے روز روشن میں سے گزر چکا ہے اور کوئی ولی کوئی پیغمبر اُسے قرون مظلمہ کے تصوف کی دھند میں واپس نہیں لا سکتا۔۱۵

حصہ سوم

اب مجھے پنڈت جواہر لال نہرو کے سوالات کی طرف آنے دیجیے۔مجھے اندیشہ ہے کہ پنڈت جی کے مضامین عملاً اسلام یا انیسویں صدی میں اس کی دینی تاریخ سے شناسائی کا انکشاف نہیں کرتے نہ ہی ظاہر ہوتا ہے کہ میں اُن کے سوالات کے موضوع پر جو پہلے ہی لکھ چکا ہوں انہوں نے پڑھ رکھا ہے۔میرے لیے ممکن نہیں کہ وہ تمام جو پہلے لکھ چکا ہوں دوبارہ یہاں پیش کروں اور نہ ہی ممکن ہے کہ انیسویں صدی کے اسلام کی تاریخ یہاں لکھوں جس کے بغیر عالم اسلام کی موجودہ صورت احوال کا پورا فہم ناممکن ہے۔ترکی اور جدید اسلام کے عنوان پر سینکڑوں کتابیں اور مضامین لکھے جا چکے ہیں اس مواد کا زیادہ تر میں مطالعہ کیا ہے اور غالباً پنڈت جی نے بھی اسکا مطالعہ کیا ہے تاہم میں اُنھیں یقین دلاتا ہوں کہ اُن لکھاریوں میں سے کوئی ایک بھی اُن اثرات کی نوعیت یا سبب جس نے یہ اثر پیدا کیا ہے نہیں سمجھتا لہٰذا ضروری ہے کہ میں انیسویں صدی کے دوران

میں ایشیاء میں مسلم فکر کے بڑے دھاروں کا اختصار سے ذکر کروں۔

میں نے اوپر کہا ہے کہ سال ۱۷۹۹ء میں مسلمانوں کا سیاسی زوال اپنے عروج کو پہنچ گیا تھا اس حقیقت کہ اسلام نے عملاً دنیا میں اپنا مقام فوراً حاصل کرلیا سے بڑا اسلام کی اندرونی قوت حیات کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔ انیسویں صدی کے دوران میں سید احمد خان ہندوستان میں، سید جمال الدین افغانی افغانستان میں اور مفتی محمد عالم جان روس میں پیدا ہوئے تھے۔ یہ حضرات غالباً محمد بن عبدالوہاب سے متاثر ہوئے تھے جو ۱۷۰۰ء میں پیدا ہوئے تھے جو نام نہاد وہابی تحریک کے بانی ہیں جن کو صحیح طور پر جدید اسلام میں زندگی کی پہلی دھڑکن کہا جاسکتا ہے۔ ۱۶ سید احمد خان کا سارا رسوخ ہندوستان تک محدود رہا۔ تاہم غالباً وہ پہلے جدید مسلمان ہیں جنھوں نے آنے والے دور کے مثبت کردار کی جھلک دیکھ لی تھی۔ اہل اسلام کے مصائب کا علاج روس میں مفتی عالم جان نے جدید تعلیم تجویز کیا تھا لیکن سید احمد خان کی حقیقی عظمت اس حقیقت پر مشتمل ہے کہ وہ پہلے ہندوستانی مسلمان تھے جنھوں نے اسلامی تعلیمات کو نئے رخ پر ڈالنے کی ضرورت محسوس کی اور اس کے لیے کام کیا ہمیں انکے دینی خیالات سے اختلاف ہوسکتا ہے لیکن کوئی اس حقیقت سے انکار نہیں کرسکتا کہ ان کی بیقرار روح ہی تھی جس نے پہلے پہل جدید دور کا اثر لیا۔

ہندوستانی مسلمانوں کی انتہائی قدامت پسندی جو زندگی کے حقائق پر اپنی گرفت کھو چکی تھی سید احمد خان کے دینی رویہ کا اصل مفہوم دیکھنے میں ناکام رہی۔ ہندوستان کے شمال مغرب میں ایک ملک جو باقی ہندوستان کی نسبت بہت قدیم اور پیشواؤں کا استحصال زدہ ہے۔ سید کی تحریک کا تعاقب فوراً احمدیت نے کیا جو سامی اور آریائی تصوف کا عجیب وغریب ملغوبہ ہے۔ جس کے ہاں اسلامی تصوف کے مطابق روحانی بقاء فرد کی باطنی زندگی کی تطہیر پر مشتمل نہیں ہے بلکہ مسیح موعود کا اہتمام کر کے عوام الناس کے متوقع رویہ کو مطمئن کرنے میں ہے۔ اس مسیح موعود کا کام فرد کو اضمحلال بخش حال سے نکالنا نہیں بلکہ غلامانہ انداز میں اس کی ہدایات کے سامنے اپنی انا سے دست برداری کیلیے تیار کرنا ہے یہ ردعمل اپنے اندر بہت لطیف تضاد رکھتا ہے یہ اسلام کے شعبہ کو تو برقرار رکھتا ہے مگر اس ارادہ کو تباہ کردیتا ہے جس سے وہ شعبہ مضبوط کرنا مقصود ہے۔

مولانا سید جمال الدین افغانی ایک مختلف چھاپ کے انسان تھے۔ فضل ربانی کے بھی انداز نرالے ہیں۔ دینی فکر و عمل میں دونوں میں ہمارے دور کے بہت زیادہ ترقی یافتہ مسلمانوں میں سے ایک افغانستان میں پیدا ہوئے جو دنیا کی تقریباً تمام اسلامی زبانوں پر عبور رکھتے تھے۔ اور جسے نہایت دلکش فصاحت عطا کی گئی۔ ان کی بے قرار روح ایران، مصر اور ترکی کے کچھ ممتاز ترین افراد پر اثر انداز ہوئی ایک مسلمان ملک سے دوسرے مسلمان ملک کی طرف ہجرت کرتی رہی۔ ہمارے دور کے کچھ عظیم ترین ماہرین دینیات مثلاً محمد عبدہ اور کچھ نوجوان نسل کے افراد جو بعد ازاں سیاسی رہنما ہوئے مثلاً مصر کے زاغلول پاشا ان کے شاگرد تھے۔ حضرت افغانی نے تحریر کم کیا اور تقریر زیادہ کی اور اس طرح اُن سب کو جن کا ان سے رابطہ قائم ہوا

چھوٹے چھوٹے جمال الدینوں میں بدل دیا۔انہوں نے ہرگز نبی یا مجدد ہونے کا دعویٰ نہیں کیا پھر بھی ہمارے دور کے کسی آدمی نے بھی ان سے زیادہ روح اسلام کو متحرک نہیں کیا اُن کی روح تا ہنوز عالم اسلام میں کارفرما ہے اور کوئی نہیں جانتا کہ کہاں رکے گی۔ پھر بھی یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ ان عظیم مسلمانوں کے حقیقی مقاصد کیا تھے جواب یہ ہے کہ انہوں نے دیکھا کہ دنیائے اسلام پر تین بڑی قوتیں حکمران ہیں اور انہوں نے اپنی ساری توانائی ان قوتوں کے خلاف بغاوت برپا کرنے میں لگا دی۔

۱) ملائیت:

علماء ہمیشہ سے اسلام کیلئے بڑی قوت کا ذریعہ رہے ہیں لیکن صدیاں گزرنے کے دوران خصوصاً بغداد کی تباہی سے وہ انتہائی قدامت پسند ہو گئے اور اجتہاد جس کا مطلب فقہی معاملات میں آزادانہ رائے قائم کرنا ہے کی کوئی آزادی نہیں دیتے۔وہابی تحریک جو انیسویں صدی کے مسلمان مصلحین کیلئے بیداری جذبہ کا ذریعہ تھی حقیقتاً علماء کے غیر لچکدار رویوں کے خلاف بغاوت تھی یوں انیسویں صدی کے مسلم مصلحین کا مقصد اول بڑھتے ہوئے تجربات کی روشنی میں فقہی تعبیر نو کیلئے حریت اور اعتماد کو نئی سمت دکھانا تھی۔

۲) تصوف:

خاص وعام مسلمان ایسے تصوف سے متاثر ہو گئے تھے جس تصوف نے حقائق پر غور نہ کیا۔لوگوں کو کمزور کر دیا اور ہر طرح کے توہم میں ڈوبائے رکھا اور تصوف روحانی تعلیم کی ایک قوت کی ارفع حالت سے گر کر محض لوگوں کی جہالت اور خوش اعتقادی سے ناجائز فائدہ اٹھانے کا ایک ذریعہ بن گیا تھا۔اس نے بتدریج اور نظر نہ آتے ہوئے منشائے اسلام کے اوسان خطا کر دیئے تھے اور فقہ اسلام کے سخت گیر نظم وضبط سے تلاشِ سکون کی حد تک اُسے نرم کر دیا تھا انیسویں صدی کے مصلحین اس تصوف کے خلاف بغاوت میں اُٹھ کھڑے ہوئے اور مسلمانوں کو جدید دنیا کے روزِ روشن کی طرف بلایا۔یہ ٹن کہ وہ مادیت پسند تھے اُن کا مشن مسلمانوں کی آنکھوں کو روحِ اسلام کی طرف کھولنا تھا جو مادیت کو فتح کرنے کی طرف لگی ہوئی تھیں اور اس سے پیچھے ہٹنے کیلئے نہیں۔

۳) مسلمان بادشاہ:

جن کی پوری توجہ ان کے اپنے حکمرانہ مفادات پر جمی ہوئی تھی اور جب تک انکے مفادات محفوظ ہوتے تھے وہ اپنا ملک سب سے اونچی بولی دینے والے کو بیچنے سے جھجکتے نہ تھے۔دنیائے اسلام میں ایسے حالات کے خلاف مسلمان عوام کو بغاوت کیلئے تیار کرنا سید جمال الدین افغانی کا خصوصی مشن تھا۔عالم اسلام کے فکر واحساس میں اُس وقت ماہیت کی تفصیل یہاں بیان کرنا ممکن نہیں ہے جس کا باعث یہ مصلحین بنے۔تاہم ایک چیز واضح ہے کہ انہوں نے بڑی حد تک لوگوں کے ایک

دوسرے گروہ مثلاً زاغلول پاشا، مصطفےٰ کمال اور رضا شاہ کیلیے زمین تیار کی۔ مصلحین نے ترجمانی کی۔ استدلال دیا اور وضاحت کی لیکن ان کے بعد آنے والا گروہ جو اگرچہ جامعاتی تعلیم میں کم تر تھا اپنی صحت مند جلت پر اعتماد کرتے ہوئے سورج کی روشنی میں بزور بازو وہ کچھ کر گزرنے کی جرأت رکھتا تھا زندگی کے نئے تقاضے جن کا مطالبہ کرتے تھے۔ ایسے لوگ غلطیوں کا ارتکاب کر سکتے ہیں لیکن تاریخ اقوام بتاتی ہے کہ اُن کی غلطیاں بھی بعض دفعہ اچھا پھل دیتی ہیں اُن میں محض باتیں بنانے کی بجائے زندگی ہوتی ہے جو اپنے مسائل حل کرنے کے لیے ان تھک جدو جہد کرتی ہے یہاں اس بات کی نشاندہی کر دی جائے کہ سید احمد خان، جمال الدین افغانی اور مسلم ممالک میں موخر الذکر کے شاگرد مغرب زدہ مسلمان نہ تھے یہ ایسے لوگ تھے جنھوں نے پرانے مدارس کے ملاؤں کے آگے زانوئے تلمذ تہہ کیے تھے۔ انہوں نے اُسی ذہنی اور روحانی فضا میں سانس لیا تھا جس کی انہوں نے بعد میں تعمیر مکدر کرنا چاہی جدید نظریات کا دباؤ تسلیم کیا جا سکتا ہے لیکن اس طرح اختصار کیساتھ اوپر بتائی گئی تاریخ واضح طور پر ظاہر کرتی ہے کہ جو انقلاب ترکی میں آیا ہے اور جو غالباً جلد یا بدیر دوسرے ممالک میں بھی آ جائے گا تقریباً سارے کا سارا اس کے اندرکی قوتوں کا طے کردہ ہے۔ جدید دنیائے اسلام کا سطحی مشاہدہ کرنے والا بھی سوچ سکتا ہے کہ دنیائے اسلام کا موجودہ بحران سارے کا سارا غیر ملکی قوتوں کی کارکردگی ہے۔

تو کیا ہندوستان سے باہر کی دنیائے اسلام یا خصوصاً ترکی نے اسلام چھوڑ دیا ہے پنڈت جواہر لال نہرو کا خیال ہے کہ ترکی بطور ایک مسلم ملک کے ختم ہو گیا ہے وہ یہ محسوس کرتے نظر نہیں آتے کہ یہ سوال کہ کسی فرد یا گروہ نے اسلام کا رکن ہونا ختم کر دیا ہے مسلم نکتہ نظر سے خالصتاً فقہی سوال ہے اور اس کا فیصلہ ضرور اسلام کی ساخت کے متعلق اصولوں کی روشنی میں کیا جائے۔ جب تک کوئی شخص اسلام کے دو بنیادی اصولوں اللہ کی توحید اور پیغمبر پاک کی ختم نبوت کا وفادار ہے کٹر ترین مُلا بھی اُسے دائرہ اسلام سے باہر نہیں نکال سکتے اگرچہ اُسکی متن قرآن کی اور فقہ کی توضیحات کا غلط ہونا بھی مان لیا جائے لیکن شاید پنڈت جواہر لال نہرو کے ذہن میں فرضی یا حقیقی نئے خیالات ہیں جو اتاترک نے متعارف کرائے ہیں۔ آیئے لمحہ بھر کیلیے اُن کا جائزہ لیں کیا یہ ترکی میں ایک عمومی مادہ پرستانہ نکتہ نظر کی پیش رفت ہے جو اسلام کے لیے خطرناک نظر آتی ہے۔ اہل اسلام نے بہت زیادہ قطع تعلقی کی ہے۔ اب وقت ہے کہ مسلمان حقائق کی طرف دیکھیں۔ مادیت دین کیخلاف بہت بڑا ہتھیار ہے لیکن یہ مُلاؤں اور صوفیوں کی چالاکیوں کے خلاف بڑا ہتھیار بھی ہے جو دانستہ جہالت اور خوش اعتقادی سے ناجائز فائدہ اُٹھانے کیلیے لوگوں کو چکر میں ڈالتے ہیں۔ روح اسلام مادے کے ساتھ اپنے رابطہ سے نہیں گھبراتی بلاشبہ قرآن کہتا ہے! ''تو دنیا میں اپنا حصہ نہ بھول''۔ ۱۷۔ گزشتہ چند صدیوں کی دنیائے اسلام کی تاریخ پر غور کرتے ہوئے ایک غیر مسلم کیلیے سمجھنا مشکل ہے کہ مادہ پرستانہ نکتہ نظر کی ترقی ایک خود اعتمادی کی شکل ہے تو کیا پھر پرانے لباس کا خاتمہ یا لاطینی رسم تحریر کو متعارف کرانا (ہی دائرہ اسلام سے اخراج کے لیے مواد ہے) بطور دین اسلام کا کوئی ملک نہیں بطور معاشرہ اسکی کوئی زبان نہیں کوئی مخصوص لباس نہیں

حتیٰ کہ قرآن کا ترکی زبان میں مطالعہ ایسی چیزیں ہیں کہ مسلمانوں کی تاریخ میں اس کی نظیر نہ ملتی ہو۔ذاتی طور پر میں اسے بصیرت کی تشویشناک غلطی سمجھتا ہوں۔کیونکہ عربی زبان کا جدید طالبعلم بالکل اچھی طرح جانتا ہے کہ غیر یورپی زبان جس کا مستقبل ہے وہ صرف عربی زبان ہے لیکن اطلاعات ہیں کہ ترکوں نے پہلے ہی ملکی زبان میں قرآن کا مطالعہ کرنا ترک کر دیا ہے تو پھر کیا تعدد ازدواج یا اجازت یافتہ علماء (ایسے مسائلِ اسلام سے اخراج کا جواز) ہیں قانونِ اسلام کے تحت مسلمان ریاست کا امیر قانون کی اجازت منسوخ کرنے کا اختیار رکھتا ہے اگر وہ قائل ہو جائے کہ یہ (اجازتیں) سماجی بدعنوانی کا باعث بننے کیطرف میلان رکھتی ہیں۔جہاں تک اجازت یافتہ علماء کا تعلق ہے اگر مجھے ایسا کرنے کا اختیار ہوتا تو میں یقیناً اُسے متعارف کراتا افسانہ طراز مُلا کی اختراعات اوسط درجے کے مسلمان کی حماقت کی وجہ سے ہیں اُسے لوگوں کی مذہبی زندگی سے خارج کرتے ہوئے اتاترک نے وہ کچھ کیا ہے جس پر ابن تیمیہ اور شاہ ولی اللہ کے دل باغ باغ ہو جائے۔نبی پاک ﷺ کی ایک روایت ہے جسکو مشکوٰۃ شریف میں بیان کیا گیا ہے کہ صرف اسلامی ریاست کے امیر کا مقرر کردہ فرد یا افراد لوگوں کو تبلیغ کرنے کا حق رکھتے ہیں۔میں نہیں جانتا کہ اتاترک کو کبھی اس روایت کا علم ہوا پھر بھی اسکے اسلامی شعور نے حیران کن انداز میں اس اہم معاملے میں اس کے دائرہ عمل کو منور کیا ہے سوئٹزر لینڈ کے مجموعہ قوانین کو اس کے قانون وراثت سمیت اختیار کرنا یقیناً ایک تشویشناک غلطی ہے جو اصلاحات کیلیے جوانی کے جوش سے پیدا ہوئی ہے اور آگے بڑھنے کی کی شدید خواہش رکھنے والے انسان کے لیے قابل معافی ہے۔دینی پیشواؤں کی چالاکیوں کی مدتوں پرانی زنجیروں سے خلاصی (۱۸کی شادمانی بعض دفعہ انسان کو عمل کی غیر آزمودہ راہوں کی طرف ہانک لے جاتی ہے لیکن ترکی اور باقی عالم اسلام نے بھی تاہنوز اسلامی قانون وراثت کے مخفی پہلوؤں کو معلوم کرنا ہے جنھیں قرآن کریم مسلم قانون کا نہایت قدیم ترین شعبہ بیان کرتا ہے کیا یہ (اسلام سے خروج) خلافت کا خاتمہ یا دین وریاست میں علیحدگی ہے۔اپنی اصل کے اعتبار سے اسلام سامراجیت نہیں ہے خلافت کے خاتمہ میں جو عملاً بنو اُمیہ کے دور میں ملوکیت کی قسم بن چکی تھی۔یہ روح اسلام ہی تو ہے جس نے اتاترک کی وساطت سے عمل کر دکھایا ہے خلافت کے معاملہ میں ترکوں کا اجتہاد سمجھنے کے لیے ہم صرف ابن خلدون سے رہنمائی لے سکتے ہیں جو عظیم ترین فلسفی مورخ اسلام اور جدید تاریخ کے بانی ہیں میں یہاں اپنی تشکیل جدید سے ایک پیرہ نقل کرنے سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا۔

ابن خلدون اپنے مشہور مقدمہ میں تین واضح آراء کا ذکر کرتے ہیں!

۱) عالمگیر امامت اللہ کا مقرر کردہ ادارہ ہے اور نتیجۃً ناگزیر ہے۔

۲) یہ محض مصلحت پر مبنی معاملہ ہے۔

۳) یہ کہ ایسے ادارے کی کوئی ضرورت نہیں۔

آخری رائے خارجیوں نے اپنائی تھی جو اسلام میں جمہوریت کے اولین حامی تھے۔معلوم ہوتا ہے کہ جدید ترکی پہلی رائے بدل کر دوسری رائے اختیار کر چکی ہے۔یعنی معتزلہ کی رائے کی طرف جو عالمگیر امامت کو صرف مصلحت کے تابع معاملہ خیال کرتے تھے۔ترکوں کی دلیل ہے کہ ہماری سیاسی فکر میں ہماری رہنمائی ہمارے گذشتہ سیاسی تجربہ سے ہونی چاہیے جو واضح طور پر اس حقیقت کی طرف نشاندہی کرتا ہے کہ عملاً عالمگیر خلافت کا نظریہ ناکام ہو چکا ہے یہ اس وقت قابل عمل نظریہ تھا جب اسلامی مملکت صحیح سالم تھی۔اس مملکت کے اختتام پر خود مختار سیاسی اکائیاں اُبھری ہیں وہ نظریہ زیر عمل نہیں رہا اور جدید اسلام کے نظم میں زندہ عنصر کے طور پر کام نہیں کر سکتا۔

دین وریاست میں علیحدگی کا نظریہ اسلام کے لیے اجنبی نہیں امام کی غیبت کبریٰ کا عقیدہ ایک طرح سے شیعی ایران میں کافی عرصہ قبل اس علیحدگی پر منتج ہوا تھا۔اسلام کے دینی اور سیاسی فرائض منصبی میں علیحدگی کے نظریہ کو یورپی دین وسیاست میں علیحدگی کے نظریہ کیساتھ ہرگز گڈمڈ نہ کیا جائے۔اول الذکر صرف فرائض منصبی کی تقسیم ہے جیسا کہ مسلم ریاست کی شیخ الاسلام اور وزرا کے دفاتر کی بتدریج تخلیق سے ظاہر ہے۔موخر الذکر روح اور مادے کی مابعد الطبعیاتی ثنویت (دو ہونا، جوڑا ہونا) پر مبنی ہے۔عیسائیت نے راہبوں کی فرمائش کے طور پر آغاز کیا جس نے دنیاوی معاملات سے کوئی واسطہ نہ رکھا۔اسلام بالکل آغاز سے ہی ایک مدنی معاشرہ تھا جس کے قوانین نوعیت کے اعتبار سے مدنی تھے جنکی اصل عقیدہ کی رو سے وحی پر مبنی ہے۔جس مابعد الطبعیاتی ثنویت پر یورپی نظریہ کی بنیاد ہے۔مغربی اقوام میں (وہ ثنویت) تلخ پھل لائی ہے۔کئی سال قبل امریکہ میں ایک کتاب لکھی گئی جو "اگر مسیح شکاگو میں آئیں" کہلاتی تھی۔اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک امریکی مصنف کہتا ہے!"مسٹر سٹیڈ کی کتاب سے سیکھنے کے قابل یہ سبق ہے کہ بڑی خرابیاں جن میں انسانیت آج مبتلا ہے اُن سے صرف مذہبی جذبات کے ذریعہ ہی نبٹا جا سکتا ہے یعنی ان خرابیوں سے نبٹنے کے کام کا حصہ ریاست کے حوالے کر دیا گیا ہے جبکہ ریاست بذات خود بدعنوان سیاسی کل پرزوں کے حوالے کر دی گئی ہے اور ایسے کل پرزے نہ صرف برائیوں سے نبٹنا چاہتے ہی نہیں بلکہ وہ نبٹنے کے اہل ہی نہیں اور یہ کہ شہریوں کی اپنے عوامی فرائض سے آگاہی کے سوا کوئی چیز بے شمار دسیوں لاکھوں کو خستہ حالی اور خود ریاست کو ذلت سے نہیں بچا سکتی۔

مسلم سیاسی تجربے کی تاریخ میں اس علیحدگی کا مطلب صرف فرائض منصبی کی علیحدگی ہے نہ کہ نظریات کی۔یہ وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ مسلم ممالک میں دین وریاست کی علیحدگی کا مطلب مسلم دستور سازی کی سرگرمی کی لوگوں کے احساس سے آزادی ہے جن کو صدیوں سے اسلامی روحانیت نے تربیت اور ترقی دی ہے۔تجربہ ہی ظاہر کرے گا کہ جدید ترکی میں یہ نظریہ کیسے کام کرے گا۔ہم اُمید کر سکتے ہیں کہ یہ خرابیاں نہیں پیدا کرے گا جو اس نے یورپ اور امریکہ میں پیدا کی ہیں۔

میں نے اوپر مختصراً نئے نظریات کے بارے میں پنڈت جواہر لال نہرو کی نسبت زیادہ تر مسلم قاری کے لیے بحث کی

ہے جن نئے نظریات کا ذکر پنڈت جی نے خصوصاً کیا ہے وہ ترکوں اور ایرانیوں کی طرف سے نسلی اور قوم پرستانہ نظریات کا بطور مثالیت اپنانا ہے۔ وہ سوچتے نظر آتے ہیں کہ ایسی مثالیت اپنانے کا مطلب ایران اور ترکی کا ترک اسلام ہے۔ تاریخ کا طالبعلم بخوبی جانتا ہے کہ اسلام اُس وقت ظہور پذیر ہوا جب اتحاد کے پرانے اصول مثلاً خونی رشتہ داری اور اقتداری ثقافت ناکام ہو رہے تھے۔ لہٰذا اسلام وحدت انسانی کے اصول گوشت پوست میں نہیں بلکہ ذہن انسانی میں پاتا ہے۔ بے شک اس کا انسانیت کو سماجی پیغام ہے کہ اپنے آپ کو نسل پرستی سے دور کر دیا دو طرفی جنگ کے ہاتھوں ختم ہو جاؤ یہ کہنا کوئی مبالغہ آرائی نہیں ہے کہ اسلام فطرت کے نسل سازی کے منصوبوں کو شک کی نظر سے دیکھتا ہے اور اپنے مخصوص اداروں کے ذریعے ایک ایسا نکتہ تخلیق کرتا ہے جو فطرت کی قوت ہائے نسل سازی کے خلاف جوابی کاروائی کرتا ہے۔

انسانی تربیت کی جانب عیسایت اور بدھ مت نے دو ہزار سال یا زیادہ عرصہ میں جتنا بھی کیا ہے اسلام نے ایک ہزار سال اُن سے بہت زیادہ کام کر دیا ہے۔ یہ معجزہ سے کم نہیں کہ ہندوستان کا مسلمان نسل اور زبان کے اختلاف کے باوجود مراکش میں خود کو اپنے گھر میں پاتا ہے۔ پھر بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اسلام نے کلی طور پر نسل کی مخالفت کی ہے اس کی تاریخ دکھاتی ہے کہ سماجی اصلاح میں یہ زیادہ تر اس تجویز پر اعتماد کرتا ہے کہ بتدریج نسل پرستی ختم کی جائے اور کم از کم مزاحمت کے طریقوں پر چلتا ہے قرآن فرماتا ہے! ”واقعی ہم نے تمہیں چھوٹے بڑے قبیلوں میں بنایا تاکہ تم پہچانے جاؤ لیکن اللہ کے ہاں تم مین سے بہترین وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ متقی ہے“۔ ١٠ نسل کے مسئلہ کی طاقتوری اور نسل پرستی کے خاتمہ کے لیے بنی نوع انسان کو جیسے لازماً زیادہ وقت درکار ہوگا اور مسئلہ نسل کی طرف اسلام کا جو رویہ ہے پر غور کرتے ہوئے یعنی بذات خود ایک نسل ساز عنصر بنے بغیر ہی دل جیتنے کو جھکنا ہی صرف منطقی اور قابل عمل رویہ ہے۔ سرارتھ کیتھ کی کتاب ”مسئلہ نسل“ میں ایک غیر معمولی پیرا ہے جو یہاں نقل کرنے کے قابل ہے۔ ”اور اب انسان اس حقیقت سے آگاہ ہو رہا ہے کہ فطرت کا ابتدائی مقصد یعنی تعمیر نسل جدید دنیائے معاشیات کی ضرورت سے مطابقت نہیں رکھتا اور انسان اپنے آپ سے پوچھ رہا ہے کہ مجھے کیا کرنا ہوگا؟ اب تک فطرت نے جو تعمیر نسل کا کام اپنائے رکھا اُسے ختم کیجئے اور دائمی سکون پایئے؟ یا فطرت کو اس پرانے رستے پر چلتے رہنے دیجئے اور اس کا لازمی نتیجہ جنگ لے لیں؟ انسان کو کوئی نہ کوئی رستہ منتخب کرنا ہوگا درمیانی راہ ممکن نہیں ہے“۔

لہٰذا یہ واضح ہے کہ اگر اتاترک اتحاد عالم تورانیت سے متاثر ہے تو وہ حالات و وقت سے مخالفت کی نسبت روح اسلام کے خلاف کچھ زیادہ نہیں چل رہا اور اگر وہ نسلوں کی حمیت پر یقین رکھتا ہے تو یقیناً نئے وقتوں کے تقاضوں سے جو مکمل طور پر روح اسلام کے ہم آہنگ ہیں مار کھا جائے گا ١٢ ذاتی طور پر میرا خیال نہیں کہ وہ اتحاد عالم تورانیت سے متاثر ہے جیسا کہ مجھے یقین ہے کہ اس کا اتحاد عالم تورانیت، اتحاد عالم سلاونیت یا اتحاد عالم جرمنیت یا اتحاد عالم سیکسونیت کو صرف دندان شکن سیاسی جواب ہے۔ اگر اوپر کے پیرا کا مفہوم صحیح طور پر سمجھ لیا جائے تو قوم پرستانہ مثالیت کے ضمن میں اسلام کا رویہ جاننا مشکل نہیں

ہے فرد کا اپنے وطن سے محبت کرنے یا وطن کی عزت پر قربان ہو جانے کے مفہوم میں قوم پرستی اسلامی عقیدہ کا جزو ہے یہ قوم پرستی اسلام کے ساتھ اس وقت جھگڑے میں داخل ہو جاتی ہے جب یہ سیاسی نظریہ کا کردار ادا کرنا شروع کر دیتی ہے اور استحکام کا اصولی ہونے کا دعویٰ کرتی ہے یہ مطالبہ کرتے ہوئے کہ اسلام صرف ذاتی نکتہ نظر کے پس منظر کی جانب ہٹ جائے اور قومی زندگی میں زندہ عنصر کے طور پر رہنا ختم کر دے۔ ترکی، ایران، مصر اور دوسرے اسلامی ممالک میں یہ (قومیت پرستی) کبھی مسئلہ نہیں بنے گی ان ممالک میں مسلمان غالب اکثریت بناتے ہیں اور ان کی اقلیتیں مثلاً یہودی، عیسائی اور زرتشی قانون اسلام کے تحت یا تو اہل کتاب ہیں یا اہل کتاب کی طرح ہیں جن کیساتھ اسلام بلا روک ٹوک سماجی تعلقات کی بشمول ازدواجی رشتہ داریاں اجازت دیتا ہے۔ یہ (قومیت پرستی) مسلمانوں کیلیے صرف ان ممالک میں مسئلہ بنتی ہے جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں اور قومیت پرستی (بطور مسلم) انکا مکمل صفایا مانگتی ہے مسلم اکثریت والے ملکوں میں اسلام قومیت پرستی کو جگہ دے دیتا ہے کیونکہ وہاں اسلام اور قومیت عملاً ایک جیسے ہوتے ہیں اقلیت والے ملکوں میں ایک ثقافتی اکائی کے طور پر خود اختیاری کی تلاش جواز رکھتی ہے ہر صورت میں وہ اپنے اصولوں سے پوری طرح ہم آہنگ ہوتی ہے۔

اوپر والا پیرا اختصار کیساتھ آج کی دنیائے اسلام کی اصل صورتِ احوال کا خلاصہ پیش کرتا ہے اگر یہ ٹھیک طور پر سمجھ لیا جائے تو واضح ہو جائے گا کہ اسلام کے استحکام کے مبادیات خارجی اور داخلی قوتوں کے ہاتھوں ہرگز متزلزل نہ ہوں گے۔ جیسا کہ میں نے پہلے وضاحت کی ہے کہ استحکام اسلام کے ڈھانچے سے متعلق دو اصولوں پر غیر متبدل ایمان پر مشتمل ہے جس میں پانچ جانے پہچانے اعمال ایمانی کا اضافہ کیا گیا ہے۔ یہ ہماری اسلامی استحکام کے لازمی اجزاء ہیں جو اسی مفہوم میں پیغمبر پاک کے دنوں سے حال ہی میں بہائیوں کیطرف سے ایران اور قادیانیوں کی طرف سے ہندوستان میں خلل ڈالنے تک رہے ہیں۔ یہ (ڈھانچہ) دنیائے اسلام میں عملاً یکساں روحانی فضا کیلیے ضمانت دیتا ہے یہ اسلامی ریاستوں کے سیاسی اتحاد کو آسان بناتا ہے جو اتحاد عالمی ریاست (مثالی) یا مسلم ریاستوں کی انجمن یا بہت سی آزاد ریاستیں جن کے معاہدے اور معاونت کا تعین خالصتاً معاشی اور سیاسی تاملات (سوچ بچار کرنا) کرتے ہیں۔ اس سادہ سے عقیدہ کا نظریاتی ڈھانچے کیساتھ تعلق زمانے کیساتھ ویسا ہی رہتا ہے۔ اس تعلق کی گہرائی صرف مخصوص قرآنی آیات کی روشنی میں ہی سمجھی جا سکتی ہے جن کی وضاحت یہاں فوری طور پر ہمارے پیش نظر نکتہ سے ہٹے بغیر نہیں کی جا سکتی۔ لہٰذا سیاسی طور پر استحکامِ اسلام صرف اس وقت متزلزل ہوتا ہے جب مسلمان ریاستیں ایکدوسرے سے برسرِ پیکار ہو جاتی ہیں اور دینی طور پر استحکام اسلام اس وقت متزلزل ہوتا ہے جب مسلمان ایمان سے وابستہ بنیادی عقائد اور اعمال سے بغاوت کر دیتے ہیں۔ یہ دائمی استحکام کے لیے مفید ہے کہ اسلام اپنے اندر کسی باغی گروہ کو برداشت نہیں کر سکتا۔ دائرہ اسلام سے باہر ایسا گروہ اتنا ہی زیادہ رواداری کا حق دار ہے جس طرح کسی دوسرے عقیدہ کے پیروکار مجھے نظر آ رہا ہے کہ اس لمحہ اسلام عبوری دور سے گزر رہا ہے یہ سیاسی استحکام کی ایک شکل سے دوسری

شکل اختیار کر رہا ہے جیسے تاریخ کی قوتوں نے ابھی متعین کرنا ہے۔ دنیائے جدید میں واقعات اتنی تیزی سے حرکت کر رہے ہیں کہ کوئی پیشن گوئی کرنا تقریباً ناممکن ہے کہ سیاسی طور پر متحد اسلام کا غیر مسلموں سے سلوک کیا ہوگا۔ اگر سیاسی طور پر عالم اسلام کے اتحاد کے حالات کبھی آتے ہیں تو اس سوال کا جواب صرف تاریخ دے سکتی ہے۔ میں یہی کچھ کہہ سکتا ہوں کہ ایشیاء اور یورپ کے راستے میں پڑے ہوئے اور زندگی پر مشرقی اور غربی نکتہ ہائے نظر کا امتزاج ہوتے ہوئے اسلام کو مشرق اور مغرب میں ثالث کا کردار ادا کرنا چاہیے لیکن اُس وقت کیا بنے گا جب یورپی حماقتیں ایک نا قابل مصالحت اسلام تخلیق کردیں گی۔ یورپ میں روز بروز بڑھتے ہوئے حالات اسلام کی طرف یورپی نکتہ نظر کی بنیادی قلب ماہیت کا مطالعہ کر رہے ہیں ہم صرف اُمید ہی کر سکتے ہیں کہ سیاسی بصیرت اپنے آپ کو سامراجی حرص کے احکامات اور ناجائز معاشی انتفاع کے ہاتھوں دھندلانے نہیں دے گی۔ جہاں تک انڈیا کا تعلق ہے میں پورے اعتماد سے کہہ سکتا ہوں کہ مسلمانانِ انڈیا ایسی کسی مثالیت کو نہیں مانیں گے جو اُن کی ثقافتی ہستی کو برباد کرنا چاہے گی ان پر غیر متذبذب اعتماد کیا جائے کہ وہ دین اور حب الوطنی کے تقاضوں میں ہم آہنگی پیدا کرنا جانتے ہیں۔

آغا خان کے بارے میں میرے لیے یہ دریافت کرنا مشکل ہے کہ کونسی چیز پنڈت جواہر لال نہرو کو آغا خان [۲۱] پر حملہ کرنے کی طرف لے گئی ہے۔ شاید وہ سوچتے ہیں کہ قادیانی اور اسماعیلی ایک ہی زمرے میں آتے ہیں صاف ظاہر ہے وہ نہیں جانتے کہ اسماعیلیوں کی مذہبی تعبیرات جتنی ہی غلط ہوں وہ اسلام کے بنیادی اصولوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ یہ درست ہے کہ وہ دائمی امامت کو مانتے ہیں لیکن انکے نزدیک امام وحی الٰہی کا وصول کرنے والا نہیں ہوتا وہ صرف قانون کا شارح ہوتا ہے۔ ابھی چند روز [۲۳] پہلے کی بات ہے (دیکھیے ستارہ الہ آباد ۱۲ مارچ ۱۹۳۴ء) کہ آغا خان نے اپنے پیروکاروں کو یہ کہہ کر خطاب کیا! "گواہی دو کہ اللہ ایک ہے۔ محمد (ﷺ) اللہ کے رسول ہیں قرآن اللہ کی کتاب ہے۔ کعبہ سب کا قبلہ ہے۔ تم مسلمان ہو اور تمہیں مسلمانوں کیساتھ رہنا چاہیے مسلمانوں کو السلام علیکم کہہ کر سلام کرو۔ اپنے بچوں کے اسلامی نام رکھو۔ مسلمانوں کیساتھ مسجدوں میں باجماعت نمازیں ادا کرو۔ باقاعدگی سے روزے رکھو۔ اپنی شادیوں کے مراسم نکاح کے اسلامی قانون کے تحت بجالاؤ۔ تمام مسلمانوں سے اپنے بھائیوں کی طرح برتاؤ کرو"۔

اب پنڈت جی فیصلہ کریں کہ کیا آغا خان اسلامی اتحاد کی نمائندگی کرتے ہیں یا نہیں؟

پنڈت جواہر لال نہرو کیطرف احمدیوں کے بارے میں خط [۲۴]

مورخہ ۲۱ جون ۱۹۳۶ء

آپ کے خط کا جو میں نے کل وصول کیا بہت بہت شکریہ جس وقت میں نے آپ کے مضامین کے جواب میں لکھا مجھے یقین تھا کہ آپ کے ہاں قادیانیوں کے سیاسی رویہ کے بارے میں کوئی تصور نہیں۔ دراصل میرے جواب لکھنے کی بڑی وجہ

بالخصوص آپ کو یہ دکھانا تھا کہ (ان لوگوں میں) مسلمانوں سے وفاداری کیسے پیدا ہوئی اور بالآخر کیسے اُس نے احمدیت میں وحی پر مبنی بنیاد پالی۔میرا تحقیقی مضمون شائع ہونے کے بعد مجھے بڑی حیرانی کی حد تک پتہ چلا کہ تعلیم یافتہ حضرات کے ہاں بھی ان تاریخی وجوہات کا کوئی تصور نہیں جنھوں نے احمدیت کی تعلیمات کو (یہ) رنگ روپ دیا۔مزید برآں پنجاب میں اور کچھ دوسری جگہوں پر آپ کے مسلمان مداحوں نے آپ کے مضامین پر اضطراب محسوس کیا کیونکہ انہوں نے سوچا کہ آپ کو احمدی تحریک سے ہمدردی ہے یہ اضطراب بڑی حد تک اس حقیقت کی وجہ سے تھا کہ احمدی آپ کے مضامین (کی اشاعت) پر شاداں وفرحاں تھے۔احمدی چھاپہ خانہ آپ کے خلاف غلط فہمی کا زیادہ تر ذمہ دار تھا۔تاہم مجھے یہ جان کر خوشی ہوئی ہے کہ آپ کے بارے میں میرا یہ تاثر غلط تھا۔مجھے خود دینیاتی مسائل میں پڑنے کی کم دلچسپی ہے لیکن احمدیوں سے انکی اپنی شرائط کیساتھ مقابلے کے لیے قدرے ہاتھ پاؤں مارنے پڑے۔میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میرا تحقیقی مضمون اسلام اور ہندوستان کے بہترین مقاصد کے تحت لکھا گیا۔میرے ذہن میں کوئی شک نہیں کہ احمدی اسلام اور انڈیا دونوں کے غدار ہیں۔۲۵لاہور میں آپ سے ملاقات کا موقع کھو دینے پر مجھے انتہائی افسوس تھا ان دنوں میں بہت بیمار تھا اور اپنے کمرے کو نہ چھوڑ سکا۔گذشتہ دوسال سے مسلسل بیماریوں کی وجہ سے میں عملاً تنہائی کی زندگی گذار رہا ہوں۔آپ مجھے ضرور بتائیں کہ اگلی دفعہ آپ پنجاب کب آئیں گے۔کیا آپ کو شہری آزادیوں کیلیے آپ کے مجوزہ اتحاد کے بارے میں میرا خط ملا۔جیسا کہ آپ نے اپنے خط میں وصول ہونے کی اطلاع نہیں دی مجھے ڈر ہے کہ آپ کو (میرا خط) نہیں ملا۔

حواشی وحوالا جات

۱)اسلام اور قادیانیت لاہور تاریخ درج نہیں

۲)گورنر پنجاب

۳)انجمن حمایت اسلام لاہور

۴)اسلام میں دینی افکار کی تشکیل جدید

۵)لاالہ الااللہ

۶)ابن صیاد اور ابن صائد کانا دجال ہی ہے جس کے بارے مین ترمذی شریف کے ابواب الفتن میں احادیث مروی ہیں۔نفس مضمون سے متعلق ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت ہے جس کا اقتباس یہ ہے کہ نبی ﷺ نے ابن صیاد کی پیٹھ پر ہاتھ مار کر فرمایا کیا تو گواہی دیتا ہے کہ مین اللہ کا رسول ہوں؟ابن صیاد نے آپ کی طرف دیکھا اور کہا میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ امیوں کے رسول ہیں (ابن عمر رضی اللہ عنہ) نے کہا پھر ابن صیاد نے کہا کیا آپ گواہی دیتے ہیں کہ میں اللہ کا رسول ہوں نبی ﷺ نے فرمایا تیرے پاس کیا کچھ (وحی) آتی ہے اس نے کہا کہ کبھی بات سچ ہوجاتی ہے اور کبھی جھوٹ پھر نبی ﷺ نے

فرمایا تجھ پر معاملہ خلط ملط ہو گیا ہے۔

۷)جہاں تک علم میں آیا ہے یہ تعارف نہ لکھا جاسکا۔

۸)اس خط کا دو تہائی سے زیادہ اسلام لاہور مورخہ ۲۲ جون ۱۹۳۵ء میں دوبارہ پیش کیا گیا۔

۹)اسلام بابت ۲۲ جون ۱۹۳۵ء

۱۰)اسلام اور احمدیت مورخہ ۲۲ جنوری ۱۹۳۶ء (صفحات ۱ تا ۴۷)

۱۱)اسلام اور احمدیت مورخہ ۲۲ جنوری ۱۹۳۶ء (صفحات ۱۶۱ تا ۱۶۶)

۱۲)اے ہندو کو بت پرستی کا طعنہ دینے والے اُس سے سیکھ بھی لے کہ عبادت کس طرح کی جاتی ہے۔

۱۳)سورۃ الحجرات آیت نمبر ۱۲

۱۴)النساء آیت نمبر ۵۹

۱۵)غائبانہ انداز خطاب کا یہ رخ جاہلانہ تصوف اور جعلی نبوت کی طرف ہے۔

۱۶)زندگی رواں دواں ندی کی مانند ہے۔ ندی کی راہ میں پہاڑ، وادیاں اور میدان آتے ہیں۔ اسی طرح زندگی کو بھی ہر طرح کے حالات و مسائل سے واسطہ پڑتا ہے۔ نت نئے سامنے آنے والے مسائل کا واحد حل اسلام میں اجتہاد ہے۔ حضرت اقبال کو اس تلخ حقیقت کا خوب احساس تھا کہ ملوک، علماء اور بعض صوفیا یا پیروں کی اکثریت طالب جاہ جمود پسند بلکہ جمود پرست قوتوں کے نمائندہ بلکہ معاونین خصوصی کا کردار ادا کر رہی ہے ان کے کلام میں ان عناصر سے بیزاری جگہ جگہ ملتی ہے۔ مثلاً رخ سوئے بت خانہ دار د پیر ما اور از ضرورت ہائے ملت بے خبر (اسرار و رموز اندرز میر نجات ص ۷۰) گھر پیر کا بجلی کے چراغوں سے ہے روشن اور زاغوں کے تصرف میں عقابوں کے نشیمن (بال جبریل: باغی مرید ص ۲۱۹) اے کشتۂ مُلائی و سلطانی و پیری (ارمغان حجاز آواز، غیب ص ۲۸) کیا نہ بیچو گے جو مل جائیں گے صنم پتھر کے (بانگ درا، جواب شکوہ ص ۲۰۱) قم باذن اللہ جو کہہ سکتے تھے وہ رخصت ہوئے خانقاہوں میں مجاور رہ گئے یا گورکن (بال جبریل خانقاہ ص ۲۱۴) مشہور کیا گیا تھا کہ محمد بن عبد الوہاب جمودِ فکر و عمل اور جاہلانہ تصوف کے خلاف سامنے آئے۔ اسی بنا پر حضرت اقبال نے انہیں اسلام کے سینے کی دھڑکن سے منسوب کیا جہاں تک وہابی تحریک کے عقائد کا تعلق ہے حکیم الامت کا اُن سے دور کا بھی واسطہ نہیں آپ کا جناب رسالت مآب ﷺ سے والہانہ لگاؤ اور دیگر اہل اللہ سے دلی عقیدت مندی وہابیت کو کہاں نصیب۔ فکر اقبال یا عشق اقبال ملاحظہ ہو! چشم تو مانی الصدور (اسرار و رموز، عرض حال ص ۱۶۸) نگاہ عشق و مستی میں وہی اول وہی آخر (بال جبریل ص ۴۱) خدارا گفت مارا مصطفٰے بس (ارمغانِ حجاز، حضور رسالت ص ۵۹)

روح را جز عشقِ او آرام نیست (پیام مشرق پیش کش ص ۲۱) از خدا محبوب تر گرد و نبی (اسرار و رموز، رکن دوم، رسالت ص

۱۰۱) تو بارش ایں جادو باخاصاں بیآمیز کہ من دارم ہوئے منزل دوست (ارمغانِ حجاز، حضورِ حق ص ۱۹) طور موجے از غبار خانہ اش کعبہ را بیت الحرم کاشانہ اش (اسرار و رموز، خودی از عشق ص ۱۹) سجودے نیست اے عبدالعزیز ایں برو بم از مشرہ خاکِ درِ دوست (ارمغانِ حجاز، حضورِ رسالت، ص ۲)

حقیقی اولیاء اور علماء کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے فراخدلی کا مظاہرہ کرتے ہیں اُن کی صفات عالیہ کا تذکرہ کرتے ہیں اور ان کیساتھ اپنے تعلق پر فخر کرتے ہیں آپ خود سلسلہ قادریہ سے متعلق تھے حضرت سید علی ہجویری کو مخدوم امم اور آپ کی قبر اطہر کو پیر سنجر را حرم کہا (اسرار و رموز حکایت نوجوانے ص ۵۱) حضرت مجدد الف ثانی کو ہند میں سرمایہ ملت کا نگہبان کہا (بال جبریل، پنجاب کے پیرزادوں سے ص ۲۲۱) مولانا نورالدین عبدالرحمٰن جامی کے تو وہ کشتہ ہیں (اسرار و رموز، خودی از عشق ص ۲۱) حضرت نظام الدین اولیاء کے دربار پر عرض کیا ہے۔ شگفتہ ہو کے کلی دل کی پھول ہو جائے یہ التجائے مسافر قبول ہو جائے بانگ درا، التجائے مسافر ص ۹۶) پیرِ رومی اُن کے رفیق راہ ہیں۔ (جاوید نامہ، خطاب بر جاوید ص ۲۰۸) عشق رسالت مآب میں وارفتگی۔ حیات النبی، علم غیب، استمداد اور توسل ایسے وہابیت مخالف مضامین اقبالیات میں بکثرت ملتے ہیں بہر طور اچھوں اور بروں میں فرق قائم رکھنا ہی متوازن فکر کی علامت اور صحت مند طرز عمل کا ضامن ہے۔ اقبال کے ہاں یہی کچھ ہے۔

۱۷) القصص آیت نمبر ۷۷

۱۸) حرم رسوا ہوا پیر حرم کی کم نگاہی سے جوانانِ تتاری کس قدر صاحب نظر نکلے
(بانگ درا، طلوع اسلام ص ۲۷۲ طباعت اول ستمبر ۱۹۲۴)

۱۹) تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ ص ۱۴۹ تا ۱۵۰

۲۰) الحجرات آیت نمبر ۱۳

۲۱) دانائے راز نے عالم اسلام کی خیر خواہی میں مسلمانوں میں ابھرنے والی ہر قیادت کی سرگرمیوں کو حسنِ ظن سے دیکھا۔ اسی طرح انہوں نے ابتداً اتاترک مصطفےٰ کمال پاشا (وفات ۱۹۳۸) اور ایران کے رضا شاہ کبیر سے ملتِ اسلامیہ کی جرأت مندانہ قیادت کیلیے اُمید وابستہ کرلی مگر یہ خوش گمانی زیادہ دیر نہ رہ سکی

نہ مصطفیٰ نہ رضا شاہ میں ہے نمود اس کی کہ روحِ مشرق بدن کی تلاش میں ہے ابھی
(ضربِ کلیم، مشرق طباعت اول جولائی ۱۹۴۳ء)

۲۲) نہرو نے دوسری باتوں کے علاوہ لکھا تھا "مجھے طویل عرصہ سے ایک مبہم قسم کا خیال رہا ہے کہ وہ (آغا خان) بمشکل صحیح العقیدہ مسلمانوں سے تعلق رکھتے ہیں اور میں نے اُن کے اس بالکل حیران کن انداز کی تعریف کی ہے جس میں انہوں نے کھل

مل جانے کا اہتمام کیا ہے اور باوقار طریقے سے اپنی شخصیت میں نہایت متضاد صفات اُٹھائے پھرتے ہیں اور اُن گونا گوں سرگرمیوں میں حصہ لیتے ہیں جو باہم مخالفانہ اور ناقابل مصالحت نظر آتی ہیں۔(ماڈرن ریویو کلکتہ نومبر ۱۹۳۵ء ص ۵۰۵)

۲۳) گویا اسلام اور احمدیت کے زیر عنوان مضمون مارچ ۱۹۴۳ء میں لکھا گیا

۲۴) جواہر لال نہرو کی کتاب ”پرانے خطوط کا گلدستہ“ لندن ۱۹۶۰ء ص ۱۸۷ تا ۱۸۸ دوبارہ پیش کیے گئے۔

۲۵) اقبال کے خطوط میں تحریف کے عنوان سے ۶ مئی ۲۰۰۰ء کے روزنامہ نوائے وقت راولپنڈی میں یہ افسوسناک اطلاع چھپی کہ لاہور کے ایک اشاعتی ادارہ فکشن ہاؤس نے جدوجہد آزادی پر ایک نظر کے عنوان سے پنڈت جواہر لال نہرو کی کتاب کا اردو ترجمہ شائع کیا ہے جس میں ملک اشفاق نے علامہ اقبال کے اس جملے کہ احمدی اسلام اور انڈیا دونوں کے غدار ہیں میں تحریف کر کے یوں کر دیا کہ احمدیوں اور مسلمانوں میں زیادہ اختلاف نہیں اور نہ ہی احمدی ہندوستان کے لیے دہشت گرد ہیں نیز یہ کہ مترجم مذکور نے اس خط کے چند اہم حصے جن میں قادیانیت کے بارے میں علامہ کے عقائد کی صحیح ترجمانی ہوتی ہے حذف کر دیے ہیں۔

☆☆☆☆ ☆☆☆☆ ☆☆☆☆

کلام اقبال میں ذکر ختم نبوت و ردّ قادیانیت

پروفیسر محمد یوسف صابر

دین فطرت از نبی آموختیم	در رہ حق مشعلے افروختیم
ایں گہر از بحر بے پایاں اوست	ما کہ یکجا نیم از احسانِ اوست
تانہ ریں رمدت زدست ماردد	ہستی ما باابد ہمدم شود
پس خدا برما شریعت ختم کرد	بر رسول ما رسالت ختم کرد
رونق ازما محفل ایام را	روز رسل راختم وما اقوام را
خدمت ساقی گری باما گذاشت	داد مارا آخریں جامے کہ داشت
لانبی بعدی زاحسانِ خدا ست	پردۂ ناموسِ دینِ مصطفےٰ است
قوم ما سرمایہ قوت ازو	حفظ سر وحدت ملت ازو
حق تعالیٰ نقشِ ہر دعویٰ شکست	تاابد اسلام راہ شیرازہ بست
دل نہ غیر اللہ مسلماں برکند	نعرہ لا قوم بعدی می زند

اسرار خودی ص۱۰۲ شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور ۱۹۷۵ء

(جہاد) ضرب کلیم ص ۲۸

فتویٰ ہے شیخ کا یہ زمانہ قلم کا ہے	دنیا میں اب رہی نہیں تلوار کارگر
لیکن جناب شیخ کو معلوم نہیں کیا؟	مسجد میں اب یہ وعظ ہے بے سود بے اثر
تیغ و تفنگ دستِ مسلماں میں ہے کہاں	ہو بھی تو دل ہیں موت کی لذت سے بے خبر
کافر کی موت سے بھی لرزتا ہو جس کا دل	کہتا ہے کون اُسے کہ مسلماں کی موت مر
تعلیم اُس کو چاہیے ترک جہاد کی	دنیا کو جس کے پنجۂ خونیں سے ہو خطر
باطل کے فال و فر کی حفاظت کے واسطے	یورپ زرہ میں ڈوب گیا دوش تا کمر

ہم پوچھتے ہیں شیخ کلیسا نواز سے	مشرق میں جنگ شر ہے تو مغرب میں بھی ہے شر
حق سے اگر غرض ہے تو زیبا ہے کیا یہ بات	اسلام کا محاسبہ یورپ سے در گزر

(ہندی اسلام) ضرب کلیم ص ۳۴

ہے زندہ فقط وحدتِ افکار سے ملت	وحدت ہو فنا جس سے وہ الہام بھی الحاد
وحدت کی حفاظت نہیں بے قوتِ بازو	آتی نہیں کچھ کام یہاں عقل خدا داد
مُلا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت	ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

(الہام اور آزادی) ضرب کلیم ص ۴۸

محکوم کے الہام سے اللہ بچائے	غارت گرِ اقوام ہے وہ صورتِ چنگیز

(نبوت) ضرب کلیم ص ۴۹

وہ نبوت ہے مسلماں کے لیے برگِ حشیش	جس نبوت میں نہیں قوت و شوکت کا پیام

وہ دانائے سبل ختم الرسل مولائے کل جس نے	غبار راہ کو بخشا فروغ وادیٔ سینا
نگاہ عشق و مستی میں وہی اول وہی آخر	وہی قرآں وہی فرقاں وہی یٰسیں وہی طٰہٰ

بال جبریل ص ۲۴

بے خبر تو جوہر آئینہ ایام ہے تو زمانے میں خدا کا آخری پیغام ہے

بانگ درا ص ۱۵۹

۱۹۰۲ء میں انجمن حیات اسلام کے جلسے میں پڑھی گئی ایک نظم بحوالہ مفکر پاکستان ص ۴۲۱ محمد حنیف شاہد

اے کے بعد از تو نبوت شد بہر مفہوم شرک بزم را روشن نہ نور شمع عرفاں کردہ ای

اقبال اور قادیانیت ص ۹۶ شائع کردہ شورش کاشمیری

ختم نبوت ضروری

اسلام میں نبوت چونکہ اپنے معراج کمال کو پہنچ گئی لہذا اس کا خاتمہ ضروری ہو گیا۔

تشکیل جدید الہیات اسلامیہ ص ۱۹۳ بزم اقبال لاہور ۱۹۵۸ء

۱۰ جون ۱۹۳۵ء کو اخبار اسٹیسٹمین کو ایک خط:

اسلام ایک دینی جماعت ہے جس کے حدود مقرر ہیں یعنی وحدت الوہیت پر ایمان، انبیاء پر ایمان اور رسول کریم

ﷺ کی ختم رسالت پر ایمان۔دراصل یہ آخری یقین ہی وہ حقیقت ہے جو مسلم اور غیر مسلم کے درمیان وجہ امتیاز ہے اور اس امر کے لیے فیصلہ کن ہے کہ فرد یا گروہ ملت اسلامیہ میں شامل ہے یا نہیں۔مثلا! خدا پر یقین رکھتے ہیں اور رسول کریم کو خدا کا پیغمبر مانتے ہیں لیکن انھیں ملت اسلامیہ میں شمار نہیں کیا جاسکتا کیونکہ قادیانیوں کی طرح وہ انبیاء کے زریعہ وحی کے تسلسل پر ایمان رکھتے ہیں اور رسول کریم کی ختم نبوت کو نہیں مانتے۔(حرف اقبال ص ۱۱۷)

اقبال کا عقیدہ:

۱۴ جنوری ۱۹۲۳ء کو خان نیاز الدین خاں کے نام ایک خط لکھتے ہیں!

[[میرا عقیدہ ہے کہ نبی کریم زندہ ہیں اور اس زمانے کے لوگ بھی اسی طرح مستفیض ہو سکتے ہیں جس طرح صحابہ ہوا کرتے تھے لیکن اس زمانے میں تو اس قسم کے عقائد کا اظہار بھی اکثر دماغوں کو ناگوار ہوگا۔اس واسطے خاموش رہتا ہوں]]۔(اقبال نامہ حصہ دوم ص ۳۱۷ مرتبہ شیخ عطاء اللہ شیخ محمد اشرف تاجر کتب کشمیری بازار لاہور)

اسلامی وحدت کے لیے خطرہ:

مسلمان ان تحریکوں کے معاملہ میں زیادہ حساس ہے جو اس کی وحدت کے لیے خطرناک ہیں۔چنانچہ ہر ایسی مذہبی جماعت جو تاریخی طور پر اسلام سے وابستہ ہو لیکن اپنی بنائی نبوت پر رکھنے اور بزعم خود اپنے الہامات پر اعتقاد نہ رکھنے والے تمام مسلمانوں کو کافر سمجھے مسلمان اسے اسلام کی وحدت کے لیے ایک خطرہ تصور کرے گا اور یہ اس لیے کہ اسلامی وحدت ختم نبوت سے ہی استوار ہوتی ہے۔(مضمون قادیانی اور جمہور مسلمان حرف اقبال ص ۱۰۴ مرتبہ لطیف احمد خاں شیروانی ناشر علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد)

اصل میں دونوں ایک ہیں:

قادیاں اور دیوبند اگر چہ ایک دوسرے کی ضد ہیں لیکن دونوں کا سرچشمہ ایک ہے اور دونوں اس تحریک کی پیداوار جسے عرف عام میں وہابیت کہا جاتا ہے۔(اقبال کے حضور حرف اقبال ص ۲۶۱ مرتبہ سید نذیر نیازی طبع اول ۱۹۷۱ء اقبال اکادمی کراچی)

قادیانی افکار کا تتبع:

حقیقت یہ ہے کہ مولانا حسین احمد یا ان کے دیگر ہم خیالوں کے افکار میں نظریہ وطنیت ایک معنی میں وہی حیثیت رکھتا ہے جو قادیانی افکار میں انکار خاتمیت کا۔(جغرافیائی حدود اور مسلمان مقالہ، مقالات اقبال ص ۲۷۸ مرتبہ سید عبدالواحد معینی، محمد عبداللہ قریشی ناشر آئینہ ادب چوک مینارا نارکلی لاہور)

روس نے بابی مذہب کو روا رکھا اور بابیوں کو اجازت دی کہ وہ اپنا پہلا تبلیغی مرکز اشک آباد میں قائم کریں۔انگلستان نے بھی

احمدیوں کے ساتھ رواداری برتی اور ان کو اپنا پہلا تبلیغی مرکز ووکنگ میں قائم کرنے کی اجازت دی۔

اقبال احمدیوں کی محفل میں:

سیالکوٹ کی ایک مسجد میں مرزا صاحب دعوائے مسیحیت کے ابتدائی ایام میں صبح صبح اپنے عقیدت مندوں کے حلقہ میں تازہ الہامات سنایا کرتے تھے ایک روز مجھے جو دل لگی سوجھی تو میں بھی وہاں جا پہنچا اور کہا کہ مجھے بھی الہامات ہوئے ہیں میں عربی کے چند جملے جن میں احمدیوں اور ان کے مذہب کی بابت مزاحیہ رنگ میں نوک جھونک تھی سنائے جس سے وہ طائفہ سخت برہم ہوا اور مجھے بھاگنا پڑا۔(ملفوظات اقبال ص ۲۹۷، مفکر پاکستان ص ۴۱۹)

دونوں پریشان:

میں نے قادیانیت کے متعلق جو بیان دیا تھا (جس میں ایک مذہبی نظریہ کی محض جدید اصول کے مطابق تشریح کی گئی تھی) اس سے پنڈت جی اور قادیانی دونوں پریشان ہیں۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ مختلف وجوہ کی بنا پر دونوں اپنے دل میں مسلمانان ہند کے مذہبی اور سیاسی استحکام کو پسند نہیں کرتے۔(پنڈت نہرو کے سوالات کا جواب، حرف اقبال ص ۱۲۰)

قادیانیوں کو اقلیت قرار دیا جائے:

میری رائے میں حکومت کے لیے بہترین طریق کار یہ ہوگا کہ وہ قادیانیوں کو ایک الگ جماعت تسلیم کرے یہ قادیانیوں کی پالیسی کے عین مطابق ہوگا اور مسلمان ان سے ویسی رواداری سے کام لے گا جیسے وہ باقی مذاہب کے معاملہ میں اختیار کرتا ہے۔(حرف اقبال ص ۱۰۹)

☆☆☆☆ ☆☆☆☆ ☆☆☆☆

عقیدہ ختم نبوت اور علامہ اقبال

ڈاکٹر محمد ظفر اقبال نوری (امریکہ)

یہ بات طے ہے کہ قرآن حکیم نے عقیدہ ختم نبوت کو بڑی وضاحت وصراحت سے بیان کیا ہے اور یہ بھی کہ حضرت اقبال کو قرآن پاک سے حد درجے کا شغف اور حضور ختمی مرتبت صاحب قرآن ﷺ سے انتہا درجے کا عشق تھا اس لیے یہ بات وہم وگمان میں بھی نہیں آسکتی کہ وہ قرآنی عقیدے کا انکار کرنے والے اور حضور خاتم النبیین ﷺ کی قصر نبوت میں نقب لگانے والے کسی جھوٹے مدعی نبوت کے طرفدار ہو سکتے ہیں۔ اسلامی طرز زندگی کی بنیاد اقبال کے نزدیک قرآن حکیم ہے۔

؎ گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن

یہی وجہ ہے کہ وہ بچپن سے لے کر تادم آخریں تلاوت قرآن کے ذوق لازوال سے سرشار رہے۔ اور قرآن حکیم کے اسرار و رموز پر تدبر و تفکر کا ذوق بھی انہیں اپنے والد گرامی شیخ نور محمد سے ورثے میں ملا تھا۔ جنہوں نے بچپن ہی میں اقبال کو سمجھا دیا تھا کہ قرآن کو اس طرح پڑھا کرو کہ گویا یہ ابھی نازل ہوا ہے۔ اور پھر انکی تلاوت قرآن اور تدبر قرآن کا یہ عالم تھا کہ ساری عمر انکی یہ عادت نہ گئی۔ حتیٰ کہ آخری عمر میں جب انکے گلے نے کام چھوڑ دیا تو وہ روزانہ کسی دوسرے شخص کو بلوا کر اس سے تلاوت قرآن سنتے تھے۔ اور اس پر اقبال کے سوانح نگار متفق ہیں کہ اقبال اپنے مطالعہ قرآن کے نوٹس لیتے رہتے تھے اور آخری عمر میں انکی خواہش اور تمنا تھی کہ وہ جدید پیرائے میں قرآن کریم کی کوئی تفسیر لکھ سکتے۔ اور یہ بات انکے اشعار پڑھ کر بھی محسوس کی جاسکتی ہے کہ وہ فکر قرآن کا کس قدر گہرا ادراک رکھتے تھے۔ ان کے سارے کلام میں جابجا ایسے اشعار ملتے ہیں جن کے مضامین بلکہ بعض جگہ الفاظ بھی قرآن حکیم سے مستعار لیے گئے ہیں۔ اگر عقیدہ ختم نبوت کے حوالے سے بھی کلام اقبال کا جائزہ لیا جائے تو کئی ایک شعر انکے عقیدے اور نکتہ نظر کی صاف وضاحت کرتے ہیں۔

ضرب کلیم میں ھندی مسلمان کے عنوان سے ایک نظم ہے

غدار وطن اس کو بتاتے ہیں برہمن
انگریز سمجھتا ہے مسلماں کو گداگر

پنجاب کے ارباب نبوت کی شریعت
کہتی ہے کہ یہ مومن پارینہ ہے کافر

دوسرے شعر کی تشریح میں مولانا غلام رسول مہر لکھتے ہیں "اس شعر میں اشارہ اس عقیدے کی طرف ہے جو قادیانیوں سے منسوب ہے کہ جو شخص مرزا غلام احمد کو نبی نہ مانے وہ مسلمان نہیں ہوسکتا۔"

جہاد کے عنوان سے ایک نظم کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں!

فتویٰ ہے شیخ کا یہ زمانہ قلم کا ہے	دنیا میں اب رہی نہیں تلوار کارگر
لیکن جناب شیخ کو معلوم کیا نہیں	مسجد میں اب یہ وعظ ہے بے سود و بے اثر

غلام رسول مہر نے ان کی شرح میں لکھا!

''شیخ نے فتویٰ دے دیا ہے کہ اب قلم کا زمانہ آ گیا ہے اور دنیا میں تلوار نام کی چیز نہیں رہی لہذا اسے چھوڑ دینا چاہیے اور صرف قلم سے کام لے کر اسلام کی خوبیاں بیان کرنی چاہیے۔'' اس مضمون کے فتوے یا اعلانات مختلف لوگوں کی طرف سے کیے گئے جن میں قادیانی حضرات بھی تھے اور بعض اور لوگ بھی وہ سب انگریزوں کے طرف دار تھے۔''

بہتر ہوتا اگر مہر صاحب دوسرے لوگوں کی نشاندہی کر دیتے۔ سکھوں کے خلاف جہاد کی بناء پر شاہ اسماعیل دہلوی اور سید احمد کو تحریک آزادی کے ہیرو قرار دیا جاتا ہے۔ سید صاحب کی سوانح عمری ''حیات طیبہ'' کے مصنف مرزا حیرت دہلوی نے اس کتاب میں لکھا کہ!

> ''حضرت شاہ اسماعیل دہلوی کلکتہ میں جہاد کے موضوع پر تقریر فرما رہے تھے، موضوع تقریر سکھوں کے مظالم ٹھہرے ان سے ایک شخص نے دریافت کیا کہ آپ انگریزوں کے خلاف جہاد کا فتویٰ کیوں نہیں دیتے؟ آپ نے جواب دیا'' ان سے جہاد کسی طرح واجب نہیں ہے، ایک تو ہم انکی رعیت میں، دوسرے ہمارے مذہبی ارکان ادا کرنے میں وہ ذرا بھی دست اندازی نہیں کرتے، ہمیں انکی حکومت میں ہر طرح کی آزادی حاصل ہے۔ بلکہ اگر ان پر کوئی حملہ آور ہو تو مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ اس سے لڑیں اور اپنی گورنمنٹ پر آنچ نہ آنے دیں۔''

ان جملہ ہائے معترضہ کے بعد اصل مجرم مرزا قادیانی کا فتویٰ بھی ملاحظہ فرمائیں!

> (۱) ''آج سے دین کے لیے لڑنا حرام کیا گیا۔ اب اسکے بعد جو دین کیلئے تلوار اٹھاتا ہے اور غازی نام رکھ کر کافروں کو قتل کرتا ہے وہ خدا اور اس کے رسول کا نافرمان ہے۔'' (اشتہار چندہ منارۃ المسیح ضمیمہ خطبہ الہامیہ)
>
> (۲) آج کی تاریخ تک تیس ہزار کے قریب یا کچھ زیادہ میرے ساتھ جماعت ہے جو برٹش انڈیا کے متفرق مقامات میں آباد ہے اور ہر شخص جو میری بیعت کرتا ہے اور مجھ کو مسیح موعود مانتا ہے اسی روز سے اس کو یہ عقیدہ رکھنا پڑتا ہے کہ اس زمانے میں جہاد قطعاً حرام

> ہے۔ کیونکہ مسیح آچکا خاص کر میری تعلیم کے لحاظ سے اس گورنمنٹ انگریزی کا سچا خیر خواہ اسکو بننا پڑتا ہے۔ (گورنمنٹ انگریزی اور جہاد ضمیمہ صفحہ نمبر:۷)

اسی ضمن میں مرزا کے یہ اشعار بھی اسکے منکر جہاد ہونے پر دال ہیں۔

اب چھوڑ دو جہاد کا اے دوستو خیال	دین کے لیے حرام ہے اب جنگ اور قتال
اب آگیا مسیح جو دین کا امام ہے	دین کیلئے تمام جنگوں کا اب اختتام ہے
اب آسماں سے نور خدا کا نزول ہے	اب جنگ اور جہاد کا فتویٰ فضول ہے
دشمن ہے وہ خدا کا جو کرتا ہے اب جہاد	منکر نبی کا ہے جو یہ رکھتا ہے اعتقاد

(ضمیمہ تحفہ گولڑویہ، صفحہ ۳۹)

یقیناً اسی لیے اقبال نے مرزا اور ہمنواؤں کی گوشمالی کی اور آخر میں سرکار برطانیہ کے ذلّہ خواروں سے سوال کیا کہ۔

ہم پوچھتے ہیں شیخ کلیسا نواز سے	مشرق میں جنگ شر ہے تو مغرب میں بھی ہے شر
حق سے اگر غرض ہے تو زیبا ہے کیا یہ بات	اسلام کا محاسبہ یورپ سے درگزر

(ضرب کلیم)

نظم ہندی اسلام

ہے زندہ فقط وحدت افکار سے ملت	وحدت ہو فنا جس سے وہ الہام بھی الحاد

یعنی قوم صرف افکار و نظریات میں اتحاد و یکسانیت کی بنیاد پر ہی زندہ رہ سکتی ہے۔ جو قوم فکری انتشار کا شکار ہو جائے وہ اپنا وجود کھو دیتی ہے۔ اور جو الہام قوم کی یکجہتی اور اتحاد کو فنا کرے وہ الہام بھی الہام نہیں بلکہ الحاد ہے۔

امامت

فتنۂ ملت بیضا ہے امامت اس کی	جو مسلماں کو سلاطین کا پرستار کرے

(ضرب کلیم)

یعنی جو مدعی امامت و قیامت مسلمانوں کو بادشاہوں کا پجاری بنائے اسکی امامت قوم کیلئے فائدے کی بجائے فتنۂ و آزمائش کا باعث ہوتی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ مرزا قادیانی نے پوری کوشش کی کہ مسلمانان ہند کو سلطنت برطانیہ کا پرستار بنایا جائے۔ ملاحظہ ہو!

> ”چنانچہ میں نے اس مقصد کے انجام کے لیے اپنی ہر ایک تالیف میں یہ لکھنا شروع کیا کہ اس گورنمنٹ برطانیہ کے ساتھ کسی طرح مسلمانوں کو جہاد درست نہیں اور نہ صرف اس قدر

بلکہ بار باراس بات پر زور دیا کہ چونکہ گورنمنٹ برطانیہ برٹش انڈیا کی رعایا کی محسن ہے اس لیے مسلمانان ہند پر لازم ہے کہ نہ صرف اتنا ہی کریں کہ گورنمنٹ برطانیہ کے مقابل بداراادوں سے رکیں بلکہ اپنی سچی شکرگزاری اور ہمدردی کے نمونے بھی گورنمنٹ کو دکھلا دیں ۔"(اشتہار لائق توجہ گورنمنٹ مندرجہ تبلیغ رسالت، جلد سوئم، صفحہ نمبر:۱۹۳)

نبوت

میں نہ عارف، نہ مجدد، نہ محدث، نہ فقیہہ	مجھ کو معلوم نہیں کیا ہے نبوت کا مقام
ہاں مگر عالم اسلام پہ رکھتا ہوں نظر	فاش ہے مجھ پہ ضمیر فلک نیلی فام
عصر حاضر کی شب تار میں دیکھی میں نے	یہ حقیقت کہ ہے روشن صفت ماہ تمام
وہ نبوت ہے مسلماں کے لیے برگ حشیش	جس نبوت میں نہیں قوت و شوکت کا پیام

(ضرب کلیم)

اس نظم کے آخری شعر میں بھی مرزا کی منکر جہاد نبوت کا تذکرہ ہے۔یعنی ایسی خودساختہ نبوت جو مسلمانوں کیلئے قوت وشوکت کی بجائے بے چارگی اور بے بسی کی پیامبر ہو اسے نبوت نہیں بھنگ کی پتی سمجھنا چاہیے۔کیونکہ بھنگ پی کر انسان بے ہوش ہوجاتا ہے اور اسکے اعضاڈھیلے پڑجاتے ہیں۔اس لیے جو قیادت جھوٹی نبوت کے نام پر مسلمانوں پر مردہ دلی طاری کررہی ہے وہ نبوت نہیں برگ حشیش ہے۔

اسلامیہ کالج کا خطاب پنجاب کے مسلمانوں سے:

اس عنوان سے اقبال نے ایک نظم ۱۹۰۲ء میں انجمن حمایت اسلام کے سالانہ اجلاس میں پڑھی۔اس کے نویں بند کا مندرجہ ذیل شعر علامہ اقبال کے عقیدہ ختم نبوت کا اظہار کرتا ہے۔

اے کہ بعداز تو نبوت شد بہ ہر مفہوم شرک   بزم را روشن زنور شمع عرفاں کردہ ای

اقبال بارگاہ رسالت مآب ﷺ میں عرض کرتے ہیں کہ یارسول اللہ ﷺ آپ ﷺ کے بعد اگر کوئی بدبخت کسی بھی مفہوم میں نبوت کا دعویٰ کرتا ہے وہ شرک فی النبوت کا مرتکب ہوتا ہے۔جب آپ ﷺ نے معرفت وعرفان کی شمع روشن کرکے بزم جہاں میں روشنیاں اوراجالے بکھیر دیئے ہیں تو اب بھلا کسی اور نبی کی گنجائش کہاں رہتی ہے۔

ضرب کلیم کی طرح رموز بے خودی میں بھی علامہ اقبال ارکان اساسی ملیہ اسلامیہ کے رکن اول توحید کے بعد رکن دوم رسالت کی وضاحت کرتے ہیں اوراس میں جہاں رسالت مآب ختم المرسلین ﷺ کی عظمت ومحبت کا ذکر کرتے ہوئے انہیں مرکز ملت قرار دیتے ہیں۔وہیں پراس عقیدے کا بھی اعلان کرتے ہیں کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے قوم مسلم پر اپنی شریعت کا

اور ہمارے رسول گرامی علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی ذات بابرکات پر رسالت کا اختتام فرمادیا ہے۔اس نظم کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

حق تعالیٰ پیکر ما آفرید	از رسالت درتن ما جاں دمید
حرف بے صوت اندریں عالم بدیم	از رسالت مصرع موزوں شدیم
از رسالت در جہاں تکوین ما	از رسالت دین ما آئین ما
از رسالت صد ہزار ما یک است	جزو ما از جزو مالا ینفک است

ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے ہمارا یعنی امت مسلمہ کا پیکر تخلیق فرمایا اور پھر رسالت سے اس بدن میں جان پھونکی۔ہم تو اس دنیا میں ایسے الفاظ تھے جنکی کوئی آواز نہ تھی۔اور پھر رسالت نے بے ربط لفظوں کو موزوں مصرع کی لڑی میں پرودیا۔رسالت ہی سے اس جہان میں ہمارا وجود ہے اور رسالت ہی سے ہمارا دین اور ہمارا آئین ہے۔رسالت ہی سے ہم لاکھوں ہونے کے باوجود ایک ہیں،اسی کی بدولت ہمارا ایک جزو دوسرے جزو کا جزو لاینفک ہے۔ان اشعار میں رسالت محمدیہ کو وحدت ملت اسلامیہ کا سبب قرار دیا گیا ہے۔جبکہ مرزائی نبوت نے اس وحدت کو پارہ پارہ کردیا۔

آں کہ شان اوست یہدی من یرید	از رسالت حلقہ گرد ما کشید
حلقۂ ملت محیط افزاستے	مرکز او وادی بطحا ستے
ماز حکم نسبت او ملتیم	اہل عالم را پیام رحمتیم
ازمیان بحر او خیزیم ما	مثل موج از ہم نمی ریزیم ما

ترجمہ: اللہ تبارک وتعالیٰ کی یہ شان ہے کہ وہ جسے چاہتا ہے ہدایت عطا فرماتا ہے۔اس نے رسالت کی صورت ہمارے گرد دائرہ کھینچ دیا ہے۔یعنی جو اس دائرے کے اندر آ گیا، ہدایت پا گیا۔دائرہ ملت جس کا مرکز وادیٔ بطحا ہے، ہردم وسعت پذیر ہے۔ہم حضور نبی اکرم ﷺ کی نسبت سے ایک ملت ہیں اور جہان والوں کے لیے رحمت کا پیغام ہیں۔ہم رسالت کے سمندر سے اٹھے ہیں اور موج کی طرح ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوتے۔

ان اشعار میں بھی ذات رسول ﷺ ہی کو مرکز ملت قرار دیا گیا ہے۔

امتش در حرز دیوار حرم	نعرہ زن مانند شیران دراجم
معنی حرفم کنی تحقیق اگر	بنگری بادیدۂ صدیق اگر
قوت قلب و جگر گرد نبی	از خدا محبوب تر گرد نبی

ترجمہ: حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی امت دیوار حرم کی پناہ میں ہے۔اور اس طرح نارہ زن ہے جس طرح جنگل میں

شیر۔اگر تو میری بات کی تحقیق کرے اور اگر تو سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی آنکھ سے دیکھے تو نبی کریم ﷺ قلب وجگر کی قوت بن جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے بھی زیادہ محبوب بن جاتے ہیں۔

ان اشعار میں بھی ذات رسالت مآب ﷺ کو حصار امت قرار دیا گیا ہے۔یعنی رسول رحمت ﷺ نے اپنی امت کو حرم کے حصار میں بٹھا دیا ہے جس طرح شیر اپنے بچوں کو جنگل میں بحفاظت بٹھا دیتا ہے۔اور اگر تو غور وفکر کرے تو یقیناً اس نتیجے پر پہنچے گا کہ رسول اللہ ﷺ کی ذات بابرکات انسان کے قلب وجان کی قوت بن جاتی ہے اور پھر ایسا مرحلہ آتا ہے کہ ذات نبی ﷺ ذات خدا جل وعلا سے بھی محبوب نظر آنے لگتی ہے۔

غور طلب امر یہ ہے کہ اقبال جب از خدا محبوب تر گرد نبوت کے کس طرح حامی ہو سکتے ہیں جو نہ صرف رسول اکرم ﷺ کے کمالات وصفات میں شرکت کا دعویدار ہو بلکہ ان سے بڑھ جانے کا احمقانہ اعلان بھی کرتا ہو۔مرزا کی بہت سی لغویات میں سے نمونے کے طور پر درج ذیل اشعار پر غور فرمائیں۔

احمد آخر زماں است آخریں جام ہمیں جام است

ترجمہ: میرا نام احمد آخر زماں ہے اور میرا جام ہی سے آخری جام ہے۔

درثمین (مرزا کا منظوم مجموعہ)

پھر کہتا ہے!

انبیاء گرچہ بودہ اندیسے	من بعرفاں نہ کمترم ز کسے
آدم نیز احمد مختار	در برم جامۂ ہمہ ابرار

ترجمہ: میں عرفاں ومعرفت میں کسی بھی نبی سے کمتر نہیں۔میں ہی آدم ہوں، میں ہی احمد مختار ہوں۔میں نے تمام ابرار کا لباس پہنا ہوا ہے۔(نزول المسیح،از مرزا قادیانی)

”اخبار پیغام صلح“ میں تو کسی اکمل نامی خبیث نے یوں ہرزہ سرائی کی!

محمد پھر اتر آئے ہیں ہم میں	اور آگے سے ہیں بڑھ کر اپنی شان میں
محمد دیکھنے ہوں جس نے اکمل	غلام احمد کو دیکھے قادیان میں

قارئین اندازہ فرمائیں کیا ایسے جھوٹے مدعی نبوت اور اسکے تعلّی باز پیروکاروں کی اقبال جیسا عاشق رسول حمایت کر سکتا ہے؟ جس کا عقیدہ ہو۔

قوت قلب وجگر گردد نبی از خدا محبوب تر گردد نبی

از رسالت ہم نوا گشتیم ما	ہم نفس ہم مدعا گشتیم ما

کثرت ہم مدعا وحدت شود	پختہ چوں وحدت شود ملت شود
زندہ ہر کثرت ز بند وحدت است	وحدت مسلم ز دین فطرت است

ترجمہ: اقبال مزید فرماتے ہیں کہ رسالت نے ہمیں ہم نوا اور ہم آہنگ کیا ہے۔ رسالت ہی کی برکت سے ہم ایک دوسرے کے ساتھی، رفیق اور ہمدرد بنے۔ اسی کی برکت سے ہم سب کا نصب العین ایک ہو گیا۔ جب ایک مدعا ایک مقصد اور ایک نصب العین والے اکٹھے ہو جاتے ہیں تو ان میں ایک وحدت آجاتی ہے۔ یہی وحدت پختہ اور پائدار ہو جاتی ہے تو ملت کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ ہر کثرت وحدت کے بندھن ہی کی وجہ سے زندہ ہوتی ہے اور مسلمانوں کی وحدت دین فطرت اسلام کی وجہ سے ہے۔

دین فطرت از نبی آموختیم	در رہ حق مشعلے افروختیم
ایں گہر از بحر بے پایان اوست	ما کہ یکجا نیم از احسان اوست
تا نہ ایں وحدت ز دست ما رود	ہستی ما با ابد ہمدم شود

ترجمہ وتشریح: دین فطرت ہم نے نبی اکرم ﷺ سے سیکھا اور پھر راہ خدا میں مشعل روشن کر دی۔ یہ دین فطرت بھی حضور رحمت ﷺ کے بے پایاں سمندر سے نکلا ہوا ایک موتی ہے اور ہم جو یکجان ہوتے ہیں تو یہ بھی حضور ﷺ کا احسان ہے۔ جب تک ہمارے ہاتھ سے یہ وحدت کا رشتہ نہیں چھوٹے گا ہمارا وجود بحیثیت ملت ابدالآباد تک باقی رہے گا۔

پس خدا بر ما شریعت ختم کرد	بر رسول ما رسالت ختم کرد
رونق از ما محفل ایام را	اُو رُسل را ختم و ما اقوام را
خدمت ساقی گری با ما گزاشت	داد ما را آخریں جامے کہ داشت

ترجمہ وتشریح: پس خدا نے اپنی شریعت ہم پر ختم کر دی اور ہمارے رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم پر رسالت ختم فرمادی۔ اب بزم جہاں کی رونق ہمارے ہی دم قدم سے رہے گی۔ ہمارے رسول ختم الرسول اور ہم قوموں کے خاتم ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے ساقی گری کی خدمت ہمارے سپرد فرمادی ہے۔ اور اہل جہاں کو فلاح وہدایت کا جو آخری جام وہ عطا کرنا چاہتا تھا وہ اس نے ہمیں عطا کر دیا ہے۔

لا نبی بعدی ز احسانِ خدا است	پردۂ ناموس دین مصطفٰے است
قوم را سرمایۂ قوت ازو	حفظ سِرّ وحدت ملت ازو
حق تعالیٰ نقش ہر دعویٰ شکست	تا ابد اسلام را شیرازہ بست
دل ز غیر اللہ مسلماں مرکند	نعرہ لا قوم بعدی می زند

ترجمہ وتشریح: پہلے شعر میں حضرت اقبال حدیث رسول ﷺ سے تلمیح لائے ہیں۔"لا نبی بعدی" میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔حدیث رسول ﷺ ہے اقبال کہتے ہیں کہ! لا نبی بعدی ہمارے حق میں اللہ کا احسان ہے۔اور ناموس دین مصطفےٰ ﷺ کا تحفظ اسی سے ہے۔یہی تصور ملت اسلامیہ کے لیے سرمایہ قوت اور وحدت ملت کے راز کی حفاظت بھی اسی سے ہے۔ اللہ تعالیٰ نے (حضور سرکار دو عالم ﷺ کی ختم نبوت کے ذریعے) تا ابد اسلام کی شیرازہ بندی فرما کر (ہر نئے اور پرانے دین کے) دعوائے (سربلندی) کا نقش مٹا دیا۔جب اللہ تعالیٰ کا یہ احسان اور حضور خاتم النبیین ﷺ کا عشق مسلمان کے دل میں سما جاتا ہے تو پھر مسلمان اللہ تعالیٰ کی ذات پر کامل توکل کر لیتا ہے اور غیر اللہ سے دل اٹھا لیتا ہے اور میرے بعد کوئی قوم نہیں ہے کا نعرہ مستانہ بلند کرتا ہے۔

قارئین کرام! اب تک آپ نے حضرت اقبال کی شاعری میں عقیدہ ختم نبوت کے بیان و اظہار سے آگاہی حاصل کی۔صرف شاعری پر موقوف نہیں انھوں نے نثر میں بھی عقیدہ ختم نبوت پر دلائل فراہم کیے ہیں۔اور نثر میں انکی شہرہ آفاق تصنیف "تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ" مجموعہ خطبات ہے۔یہ خطابات انگریزی زبان میں دیے گئے تھے اور ان کا ترجمہ سید نذیر نیازی نے اقبال ہی کے کہنے پر کیا تھا۔اس میں پانچواں خطبہ "اسلامی ثقافت کی روح" کے عنوان سے ہے۔اس میں بھی انھوں نے عقیدہ ختم نبوت کو فلسفہ اور تعقل کی روشنی میں بڑی شد و مد سے ثابت کیا ہے۔اقتباس ملاحظہ ہو!

> "اس لحاظ سے دیکھا جائے تو یوں نظر آئے گا جیسے پیغمبر اسلام کی ذات گرامی کی حیثیت دنیائے قدیم اور جدید کے درمیان ایک واسطہ کی ہے۔بہ اعتبار اپنے سرچشمہ وحی کے آپ ﷺ کا تعلق دنیائے قدیم سے ہے لیکن بہ اعتبار اس کی روح کے آپ ﷺ کا تعلق دنیائے جدید سے ہے۔یہ آپ ﷺ کا ہی وجود ہے کہ زندگی پر علم و حکمت کے وہ تازہ سر چشمے منکشف ہوئے جو اس کے آئندہ رخ کے عین مطابق تھے۔لہٰذہ اسلام کا ظہور جیسا کہ آگے چل کر خاطر خواہ طریق پر ثابت کر دیا جائے گا۔استقرائی عقل کا ظہور ہے۔اسلام میں نبوت چونکہ اپنے معراج کمال کو پہنچ گئی، لہٰذا اس کا خاتمہ ضروری ہو گیا۔اسلام نے خوب سمجھ لیا تھا کہ انسان ہمیشہ سہاروں پر زندگی بسر نہیں کر سکتا، اس کے شعور ذات کی تکمیل ہوگی تو یونہی کہ وہ خود اپنے وسائل سے کام لینا سیکھے۔یہی وجہ ہے کہ اسلام نے اگر دینی پیشوائی کو تسلیم نہیں کیا، یا موروثی بادشاہت کو جائز نہیں رکھا، یا بار بار عقل اور تجربے پر زور دیا، یا عالم فطرت اور عالم تاریخ کو علم انسانی کا سرچشمہ ٹھہرایا تو اس لیے کہ ان سب کے اندر یہی نکتہ مضمر ہے۔کیونکہ یہ سب تصور خاتمیت کے مختلف پہلو ہیں۔لیکن یہ غلط فہمی نہ ہو کہ

حیات انسانی اب وارداتِ باطن سے جو باعتبار انبیاء کے احوال وواردات سے مختلف نہیں ، ہمیشہ کے لئے محروم ہو چکی ہے۔ قرآن مجید نے "آفاق والنفس" دونوں کو علم کا ذریعہ ٹھہرایا ہے۔ اور اسکا ارشاد ہے کہ آیات الٰہیہ کا ظہور محسوسات و مدرکات میں، خواہ ان کا تعلق خارج کی دنیا سے ہو یا داخل کی، ہر کہیں ہو رہا ہے۔ لہٰذہ ہمیں چاہیے اسکے ہر پہلو کی قدر و قیمت کا کما حقہٗ اندازہ کریں اور دیکھیں کہ اس سے حصول علم میں کہاں تک مدد مل سکتی ہے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ تصور خاتمیت سے یہ غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ زندگی میں اب صرف عقل ہی کا عمل دخل ہے۔ جذبات کے لیے اس میں کوئی جگہ نہیں ۔ یہ بات نہ کبھی ہو سکتی ہے نہ ہی ہونی چاہیے۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ وارداتِ باطن کی کوئی شکل بھی ہو ہمیں بہر حال حق پہنچتا ہے کہ عقل وفکر سے کام لیتے ہوئے اس پر آزادی سے تنقید کریں۔ اسلیے کہ اگر ہم نے ختم نبوت کو مان لیا تو گویا عقیدۃً یہ بھی مان لیا کہ اب کسی شخص کو اس دعوے کا حق نہیں پہنچتا کہ اس کے علم کا تعلق چونکہ کسی مافوق الفطرت سرچشمے سے ہے لہٰذا ہمیں اس کی اطاعت لازم آتی ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو خاتمیت کا تصور ایک طرح کی نفسیاتی قوت ہے جس سے اس قسم کے دعوؤں کا قلع قمع ہو جاتا ہے۔"

خطبات کے اس طویل اقتباس میں اگر خط کشیدہ الفاظ پر غور کیا جائے تو یہ حقیقت اظہر من الشمس ہو جاتی ہے کہ حضرت اقبال کے ہاں عقیدہ ختم نبوت نہ صرف اسلام کا اساسی عقیدہ ہے بلکہ عقل وشعور کے اعتبار سے اب کسی نبی کا آنا ناممکن ومحال ہے۔ اقبال چونکہ کسی تازہ نبوت کے امکان ہی کے قائل نہیں اس لیے انھوں نے دارالعلوم دیوبند کے بانی مولانا قاسم نانوتوی کے اس نکتہ نظر کو بھی اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا جس میں کہا گیا تھا کہ! "

اگر بالفرض حضور ﷺ کے بعد بھی کوئی نبی آجائے تو آپ ﷺ کی خاتمیت پر فرق نہیں پڑتا"۔

اپنی تصنیف "تحذیر الناس" میں بانی دارالعلوم نے یہ بھی لکھ رکھا ہے کہ!

"انبیاء اگر امتیوں سے افضل ہوتے ہیں تو علم میں ہی ہوتے ہیں، جہاں تک عمل کا تعلق ہے اس میں امتی ان کے برابر بھی ہو سکتے ہیں اور بعض اوقات بڑھ بھی جاتے ہیں"۔

اسی فکر کو بنیاد بناتے ہوئے مرزا غلام احمد قادیانی نے نبی ہونے کا دعویٰ کیا اور کہا کہ میرے نبی ہونے سے نبی اکرم ﷺ کی خاتمیت پر کوئی فرق نہیں پڑتا اور پھر اس نے یہ جسارت بھی کی کہ اس کو حضور ﷺ پر جزوی فضیلت حاصل ہے۔ حضرت اقبال اس کو برداشت نہیں کر سکے اور انھوں نے علامہ سید سلیمان ندوی کو ایک خط لکھ کر استفسار کیا کہ!

> ”کیا کوئی شخص جزوی طور پر رسالت مآب ﷺ سے افضل ہوسکتا ہے۔اگر کوئی شخص جو اسلام کا مدعی ہے یہ کہے کہ مرزا غلام احمد قادیانی کو حضور رسالت مآب ﷺ پر جزوی فضیلت حاصل ہے اس واسطے کہ مرزا غلام احمد قادیانی ایک زیادہ متمدن زمانہ میں پیدا ہوئے تو کیا ایسا شخص توہین رسالت کے جرم کا مرتکب ہے؟“ بالفاظ دیگر اگر توہین رسول جرم قابل تعزیر ہے تو عقیدہ مذکور توہین رسول کی حد میں آتا ہے یا نہیں؟“ (مکاتیب اقبال مرتبہ شیخ عطاءاللہ)

علامہ ندوی کا تعلق بھی چونکہ مولانا نانوتوی ہی کے فکری قبیلے سے تھا اس لیے انھوں نے اقبال کو جواب دیا کہ!

> ”حضور ﷺ پر کسی کو جزوی فضیلت ہونا جائز ہے اور ایسا کہنا نہ کفر ہے اور نہ توہین نبی کا باعث ۔ البتہ مقتضائے محبت کے خلاف ہے“۔(اقبال اور قادیانی نعیم آسی : بحوالہ سازشوں کا دیباچہ از رائے محمد کمال)

حضرت اقبال نے علامہ ندوی کے نکتہ نظر کو کبھی تسلیم نہیں کیا اس لیے ”انوار اقبال“ کے مصنف بشیر احمد ڈار کے مطابق انھوں نے اپنے نقطہ نظر کا اظہار یوں فرمایا!

> ”ختم نبوت کے معنی یہ ہیں کہ کوئی شخص بعد اسلام اگر یہ دعویٰ کرے کہ مجھ میں ہر دو اجزا نبوت کے موجود ہیں، یعنی یہ کہ مجھے الہام وغیرہ ہوتا ہے اور میری جماعت میں داخل نہ ہونے والا کافر ہے تو وہ شخص کافر ہے اور واجب القتل ہے۔مسیلمہ کذاب کو اسی بنا پر قتل کیا گیا حالانکہ (ابی جعفر محمد بن جریر) طبری لکھتا ہے کہ وہ رسالت مآب ﷺ کی نبوت کا مصدق تھا اور اس کی اذان میں حضور ﷺ کی نبوت کی تصدیق تھی“۔(انوار اقبال از بشیر احمد ڈار)

(علامہ اقبال اور قادیانیت)

حکیم الامت شاعر مشرق حضرت علامہ اقبال ان رجال کار میں سے ہیں جو صدیوں کے بعد پیدا ہوتے ہیں اور اپنے علم و عمل اور تعلیمات سے انسانیت کی ایسی خدمت کرتے ہیں کہ انکے فکر و فلسفہ کا فیضان عملی ان کے بعد بھی صدیوں تک جاری رہتا ہے۔ایسی ہی شخصیات کے لیے اقبال کہتا ہے!

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

یقیناً حضرت اقبال خود بھی ایسے ہی دیدہ ور تھے جن سے اہل جہاں صدیوں تک اخذ فیض کرتے رہیں گے۔ایسی شخصیات کے

ساتھ ایک المیہ یہ رونما ہوتا ہے کہ ایک طرف وہ لاکھوں کروڑوں لوگوں کے قلب و روح کو متاثر کرتے ہیں اور ان کے محبوب بن جاتے ہیں اور دوسری طرف قلیل تعداد میں انکے حاسدین اور ناقدین بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ جو موقع بے موقع حیلے بہانے سے کثیر خلق کی ممدوح شخصیات کے خلاف زہر اگلتے رہتے ہیں۔ علامہ اقبال کے خلاف قلیل سے بھی قلیل تر تعداد میں کچھ لوگ ہیں جو وقتاً فوقتاً اپنے خبث باطن کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ ویسے بھی ہمارے عہد میں فکری بالشتیوں نے تعصب کے کدال اور حسد کے پھاوڑے لے کر اکابر شکنی کی مہم شروع کر رکھی ہے۔ اس سے نہ تو ان فکری بالشتیوں کے قد میں اضافہ ہوتا ہے اور نہ ہی ان کوہ گراں جیسی عظیم شخصیات کی عزت و عظمت کا کوئی کنگرہ ٹوٹتا ہے۔ البتہ عوام کے دل و دماغ میں تشکیک کے کانٹے چبھ جاتے ہیں۔ بہت سی باتیں غلط العام ہو جاتی ہیں۔ جن پر کوئی یقین بھی نہیں کرتا مگر محفلوں میں کبھی تفنن طبع کے لیے اور کبھی اپنی جھوٹی علیمت ظاہر کرنے کے لیے دھرایا جاتا ہے۔ اسی طرح بے سروپا باتیں حضرت اقبال کے متعلق بھی سینہ گزٹ کے طور بھی کہی جاتی رہی ہیں۔ وہ شراب پیتے تھے، گانا سننے جاتے تھے، انھوں نے قتل کر دیا تھا۔ اسی طرح آجکل ایک غلط فہمی کی ایک اور گردیوں اڑائی جارہی ہے کہ وہ مرزائی تھے یا مرزائیوں سے انکا کوئی تعلق تھا۔ پہلے وہ قادیانی تھے پھر سیاسی وجوہات کی بنا پر ان سے الگ ہو گئے۔ پہلے جو اتہامات ہیں انکا تو کوئی سر پیر ہی نہیں ہے وہ ہستی جس کی زندگی کی راتیں کبھی سوز و ساز رومی اور کبھی پیچ و تاب رازی میں گزری ہوں۔ خاک مدینہ و نجف جسکی آنکھ کا سرمہ ہو اور دانش فرنگ کا جلوہ بھی جسے خیرہ نہ کر سکا ہو، جو تصور ہی تصور میں ہر وقت مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کی طرف محو سفر رہتا رہا ہو

بایں پیری رہ یثرب گرفتم	نواخواں از سرور عاشقانہ
چو آں مرغے کہ در صحرا سر شام	کشاید پر بہ فکر آشیانہ

اور کبھی اس سے بھی آگے بڑھ کر وہ بارگاہ رسالتماب ﷺ میں عرض گزار رہا ہو

تو فرمودی رہ بطحا گرفتیم	وگرنہ جز تو مارا منزل نیست

رسول رحمت ﷺ کا نام نامی آتے ہی جس پر گریہ طاری ہو جاتا ہو اس کے بارے میں شراب و شباب کے فسانے مشہور کرنا حسد اور تعصب کا شاخسانہ ہی ہو سکتا ہے۔ ان کے مستند سوانح نگار فقیر سید وحید الدین کی ''فقیر روزگار'' پڑھیے یا فرزند اقبال کی تحقیقی تصنیف ''زندہ رود'' کا مطالعہ کیجئے۔ کہیں آپ کو ان لایعنی الزامات کا شائبہ تک نظر نہیں آئے گا۔ اگر تحقیق کی جائے تو اسکے پیچھے بھی قادیانی لابی اور قادیانی نواز صحافی عبدالمجید سالک اور م ش جیسے نام نہاد مداحین اقبال کے نام ملیں گے۔ جنھوں نے زیب درستاں کے لیے یا قادیانیوں کو فائدہ پہنچانے کے لیے ایسی کمزور باتیں لکھ دیں جن کو بنیاد بنا کر لوگوں نے ہزار داستان تراش لی۔ ''زندہ رود'' میں فرزند اقبال ڈاکٹر جاوید اقبال نے سختی سے اس تاثر کی تردید کی ہے کہ علامہ اقبال اپنی زندگی کے کسی بھی مرحلے پر قادیانی یا ان کا قادیانیوں سے کوئی مہر و محبت کا تعلق تھا۔ مرزا قادیانی کے سیالکوٹ میں بسلسلہ ملازمت

قیام کی وجہ سے کچھ لوگوں سے جو روابط تھے اسی طرح خاندان اقبال کے کچھ لوگوں کا بھی اس سے رابطہ رہا۔انکے دعویٰ نبوت کے بعد اکثر نے ان کو چھوڑ دیا اور کچھ پھر بھی اس کے دام تزویر سے باہر نہ نکل سکے۔اس سلسلہ میں ''زندہ رود'' کا اقتباس ملاحظہ فرمائیں!

> ''اقبال کی زندگی میں ان کے احمدی نقادوں نے ان کے متعلق یہ باتیں نہ کہی تھیں۔جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بعد کی سوچ بچار کا نتیجہ ہیں۔بہر حال اس بات میں کوئی صداقت نہیں کہ اقبال نے اپنی زندگی کے کسی بھی مرحلے پر مرزا غلام احمد کی بیعت کی یا احمدیت کے ساتھ ان کا گہرا تعلق رہا۔اسی طرح یہ کہنا بھی درست نہیں کہ ان کے والد شیخ نور محمد احمدی تھے۔البتہ ان کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد نے اپنی زندگی کے ایک حصے میں احمدی مسلک کو قبول کیا اور کچھ مدت تک جماعت احمدیہ میں شامل رہے۔مگر بقول ان کے فرزند شیخ مختار احمد اور دختران عنایت بیگم،وسیمہ بیگم کے انھوں نے بعد ازاں احمدیت کو ترک کر کے جماعت سے رشتہ توڑ لیا تھا۔شیخ عطا محمد،اقبال کی وفات کے تقریباً دو سال بعد ۲۲ دسمبر، ۱۹۶۰ کو سیالکوٹ میں فوت ہوئے۔اور انھیں امام صاحب کے معروف قبرستان میں دفنایا گیا۔ان کے جنازے میں راقم بھی شریک تھا،نماز جنازہ شہر کے ایک سنی امام مولوی سکندر خان نے پڑھائی۔البتہ شیخ اعجاز احمد اور ان کے چند احمدی احباب نے غالباً شیخ عطا محمد کے گذشتہ یا مفروضہ عقیدے کے پیش نظر علیحدہ نماز جنازہ پڑھی۔شیخ عطا محمد کی اولاد میں صرف شیخ اعجاز احمد احمدی عقیدہ رکھتے ہیں۔'' (بحوالہ زندہ رود،صفحہ نمبر: ۶۲۵ از ڈاکٹر جاوید اقبال)

''زندہ رود'' ہی میں ڈاکٹر جاوید اقبال نے اقبال کے احمدی بھتیجے اور ''مظلوم اقبال'' کے مصنف شیخ اعجاز احمد کے ایک خط کے مندرجات نقل کیے ہیں جس میں ملت قادیانیہ کے پرانے الزامات دھرائے ہیں اور دلائل دینے کی کوشش کی ہے کہ اقبال پہلے مرزا غلام احمد قادیانی کو اسلامی مفکر اور احمدیوں کو اچھے مسلمان سمجھتے تھے۔بعد ازاں ۱۹۳۵ء میں بعض احراری علماء کے کہنے میں آ کر انھوں نے قادیانیوں کی مخالفت شروع کر دی۔

ڈاکٹر جاوید اقبال نے شیخ اعجاز احمد کے دلائل کا بڑا مفصل اور مضبوط جواب دیا ہے۔جسے زندہ رود میں دیکھا جا سکتا ہے۔اقبال یا انکے والد شیخ نور محمد مرحوم کے قادیانی ہونے کی تردید کے لیے کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں مرزا قادیانی کے بیٹے اور جانشین مرزا بشیر الدین محمود کی گواہی کافی ہے۔ملاحظہ ہو!

"ڈاکٹر سر اقبال جو سیالکوٹ کے رہنے والے تھے ان کے والد کا نام شیخ نور محمد تھا..... شیخ نور محمد نے غالباً ۱۸۹۱ء میں مولوی عبدالحکیم صاحب مرحوم اور سید حامد علی شاہ صاحب مرحوم کی تحریک پر حضرت مسیح علیہ السلام (مرزا قادیانی) کی بیعت کی تھی۔ ان دنوں سر محمد اقبال سکول میں پڑھتے تھے اور اپنے باپ کی بیعت کے بعد اپنے آپ کو احمدیت میں شمار کرتے تھے۔ اور حضرت مسیح علیہ السلام (مرزا قادیانی) کے معتقد تھے۔ چونکہ سر اقبال کو بچپن سے ہی شعر و شاعری کو شوق تھا اس لیے ان دنوں میں انھوں نے سعد اللہ لدھیانوی کے خلاف حضرت مسیح علیہ السلام (مرزا قادیانی) کی تائید میں ایک نظم بھی لکھی تھی۔ مگر چند سال بعد جب آپ کالج پہنچے تو انکے خیالات میں تبدیلی آ گئی اور انھوں نے اپنے باپ کو سمجھا بجھا کر احمدیت سے منحرف کر دیا۔ چنانچہ شیخ نور محمد صاحب نے حضرت مسیح علیہ السلام (مرزا قادیانی) کی خدمت میں ایک خط لکھا جس میں یہ تحریر کیا کہ آپ میرا نام اس جماعت سے الگ رکھیں۔ اس پر حضرت مسیح علیہ السلام (مرزا قادیانی) کا جواب میر حامد شاہ کے نام گیا، جس میں لکھا تھا کہ شیخ نور محمد کو کہہ دیں کہ وہ جماعت سے الگ ہی نہیں بلکہ اسلام سے بھی الگ ہیں۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال اپنی زندگی کے آخری ایام میں احمدیت کے شدید مخالف رہے اور ملک کے نو تعلیم یافتہ طبقہ میں احمدیت کے خلاف جو زہر پھیلا ہوا ہے اسکی بڑی وجہ ڈاکٹر سر محمد اقبال کا مخالفانہ پراپیگنڈہ تھا۔" (بحوالہ سیرت مہدی، جلد نمبر: ۳، مرزا بشیر احمد ایم اے)

اس حوالہ کو پڑھ لینے کے بعد کون دانا شخص ملت قادیانیہ کے اس پراپیگنڈے پر یقین کرے گا کہ وہ ۱۹۳۰ء تک مرزا کی بیعت میں رہے ان کو مجدد مانتے تھے۔ جب وہ میٹرک کے بعد کالج پہنچتے ہی مرزا غلام احمد قادیانی کی بیعت سے اپنے والد کو منحرف کرا لیتے ہیں اور مرزا موصوف ان کے والد کو دائرہ اسلام ہی سے خارج کر دیتے ہیں تو پھر بھلا علامہ اقبال کے مرزائیت سے وابستہ رہنے کی کیا منطق بچتی ہے۔ خود اقبال کے برادرزادہ شیخ اعجاز احمد نے بھی علامہ اقبال کی مرزا سے بیعت کو تسلیم نہیں کیا۔ "علامہ اقبال چچا جان کے متعلق "زندہ رود" میں لکھا ہے کہ!

"اس بات میں کوئی صداقت نہیں کہ علامہ اقبال نے کسی مرحلے پر مرزا غلام احمد کی بیعت کی تھی۔ مجھے احمدیہ لٹریچر میں علامہ اقبال کی کسی مرحلے پر بیعت کرنے کی کوئی معتبر شہادت نظر نہیں آئی۔" (مظلوم اقبال: شیخ اعجاز احمد صفحہ: ۹۰-۱۸۹)

بعض لوگ کہتے ہیں کہ اگر علامہ اقبال قادیانیت کو اچھا نہیں سمجھتے ہوتے تو اپنے قادیانی بھتیجے شیخ اعجاز احمد کو جاوید اقبال اور اپنی بیٹی منیرہ بیگم کا گارڈین کیوں مقرر کیا۔ ڈاکٹر جسٹس جاوید اقبال کے بقول اسکی وجہ انکا اقبال کا برادرزادہ ہونا اور اخلاق و کردار کے اعتبار سے اصول کا عالی ظرف، بردبار، سادہ، نیک شفیق، حلیم کن اور صلح کن طبیعت کا حامل ہونا تھا۔ اس لیے اقبال انکو صالح آدمی سمجھتے تھے۔ ڈاکٹر جاوید اقبال کے بقول!

> ''شیخ اعجاز احمد کی صالحیت کی ایک مثال یہ ہے کہ انھوں نے کسی پر اپنا عقیدہ ٹھونسنے کی کوشش نہیں کی۔ لہٰذا انکی اولاد میں سے جو دو بیٹوں اور تین بیٹیوں پر مشتمل ہے کوئی بھی انکے عقیدے اور مسلک کا حامی نہیں بلکہ ختم نبوت کے مسئلے پر ان سب کا موقف وہی ہے جو مسلمانوں کا موقف ہے۔ دوسری مثال انکی صالحیت کی یہ ہے کہ اقبال کے نابالغ بچوں کے ولی کی حیثیت سے انھوں نے اپنے فرائض نہایت دیانتداری اور خوش اسلوبی سے انجام دیئے۔ اور راقم اور منیرہ انکا یہ احسان کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔'' (زندہ رود، صفحہ نمبر: ۶۲۶، از ڈاکٹر جاوید اقبال)

علامہ اقبال نے بقول جاوید اقبال اپنے قادیانی بھتیجے کو دیانتدار اور صالح آدمی سمجھتے ہوئے اپنے نابالغ بچوں کے گارڈین گروپ میں شامل کیا لیکن انہیں اسکے قادیانی ہونے کا افسوس بھی تھا۔ اس لیے وہ اسکا نام گارڈین کی فہرست سے خارج کر کے سرراس مسعود کو اس کی جگہ مقرر کرنا چاہتے تھے۔ سرراس مسعود کے انکار کے بعد انھوں نے شیخ اعجاز احمد ہی کو بحال رکھا۔ ملاحظہ ہو!

علامہ اقبال کا خط محررہ ۱۰ جون ۱۹۳۷ء بنام سرراس مسعود

> ''نمبر ۳: شیخ اعجاز احمد میرا بڑا بھتیجا ہے، نہایت ہی صالح آدمی ہے۔ مگر افسوس ہے کہ دینی عقائد کی رو سے قادیانی ہے۔ تم کو معلوم ہے کہ ایسا عقیدہ رکھنے والا مسلمان بچوں کا گارڈین ہوسکتا ہے یا نہیں۔ اس کے علاوہ وہ خود بہت عیال دار ہے اور عام طور پر لاہور سے باہر رہتا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اسکی جگہ تم کو گارڈین مقرر کروں۔ مجھے امید ہے کہ تمھیں اس پر کوئی اعتراض نہ ہوگا۔'' ڈاکٹر جاوید اقبال نے زندہ رود میں اس خط کو ''اقبال نامے'' مرتبہ اخلاق اثر بھوپال سے لیا ہے اور ذکر کیا ہے کہ یہ خط ''اقبال نامہ'' مرتبہ شیخ عطا اللہ صفحات پر بھی موجود ہے۔ لیکن خط کی فوٹو کاپی کے مطابق اصل عبارت یوں ہے ''تم کو معلوم ہے کہ قادیانیوں کے عقیدے کے مطابق تمام مسلمان کافر ہیں۔ اس واسطے یہ امر شرعاً مشتبہ ہے

کہ ایسا عقیدہ رکھنے والا آدمی مسلمان بچوں کا گارڈین ہو سکتا ہے یا نہیں۔" (حصہ ایک خط کا اقبالیت، جلد ۲۸، شمارہ ۲ جولائی ۱۹۸۷ء)

اس خط سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت اقبال قادیانیوں کو مسلمانوں سے الگ جماعت سمجھتے تھے۔ ڈاکٹر جاوید اقبال نے قادیانیوں کے اس پراپیگنڈے کی تردید بھی کی ہے جس میں دعویٰ کرتے ہیں کہ شروع میں علامہ اقبال قادیانیوں کے حامی تھے بعد میں مخالف ہوئے۔ اس ضمن میں انھوں نے انجمن حمایت اسلام کے سالانہ اجلاس منعقدہ ۲۲ فروری ۱۹۰۲ء میں اقبال کی پڑھی گئی نظم بعنوان "اسلامیہ کالج کا خطاب پنجاب کے مسلمانوں سے" کے نویں بند کا نعتیہ شعر نقل کیا ہے:

؎ اے کہ بعد از تو نبوت شد بہ ہر مفہوم شرک — بزم را روشن ز نور شمع عرفاں کردۂ

اور پھر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے!

"اس شعر کو نظم میں شامل کرنے سے صاف ظاہر ہے کہ اس زمانے میں عقیدہ ختم نبوت کے بارے میں احمدیت نے جو الجھاؤ پیدا کر دیا تھا اور جس کے باعث مسلمانوں کے ذہن مضطرب تھے اس کی تردید مقصود تھی۔ ورنہ کسی بھی مفہوم میں ختم نبوت کے عقیدے کو تسلیم نہ کرنا اقبال کے نزدیک شرک فی النبوت کیوں قرار پاتا۔" (زندہ رود، صفحہ نمبر: ۶۲۶)

اس کے بعد ڈاکٹر جاوید اقبال نے علامہ اقبال کی ایک اہم نظم کا ذکر کیا ہے جو پیغام بیعت کے جواب میں لکھی گئی۔ جو "محون" بابت مئی ۱۹۰۲ء میں اور محمد دین فوق کے اخبار پنجۂ فولاد مورخہ ۱۱ جون ۱۹۰۲ء میں شائع ہوئی۔ اس نظم کو احمدی ہفت روزہ "الحکم" قادیان نے اپنی ۱۰، ۱۷، ۱۰ اور ۲۴ جنوری ۱۹۰۳ء کی اشاعت میں نقل کیا اور مرزا غلام احمد کے ایک مخلص مرید سید حامد شاہ کا منظوم جواب بھی شائع کیا۔ "باقیات اقبال" اور "معاصرین اقبال کی نظر میں" کے مرتب محمد عبداللہ قریشی کے مطابق سید حامد شاہ مولانا سید میر حسن کے عزیز تھے اور اقبال کے دوست اور ہم محلہ تھے۔ ممکن ہے انھوں نے ہی اقبال کو مرزائیت کی بیعت کے لیے لکھا ہو اور پھر جواب میں اقبال کی نظم پڑھ کر اس کا جواب لکھا ہو۔

اقبال کی نظم ملاحظہ ہو!؎

پردہ میم میں رہے کوئی	اس بہلاوے کو جانتا ہوں میں
تنکے چن چن کے باغ الفت کے	آشیانہ بنا رہا ہوں میں
ایک دانہ پر ہے نظر تیری	اور خرمن کو دیکھتا ہوں میں
تو جدائی پہ جان دیتا ہے	وصل کی راہ سوچتا ہوں میں
بھائیوں میں بگاڑ ہو جس سے	اس عبادت کو کیا سراہوں میں

مرگ اغیار پہ خوشی ہے تجھے	اور آنسو بہا رہا ہوں میں
میرے رونے پہ ہنس رہا ہے تو	تیرے ہنسنے کو رو رہا ہوں میں

(باقیات اقبال بحوالہ زندہ رود ص ۶۲۷)

قادیانیوں کے اخبار "الحکم" قادیان نے ۲۸ اگست ۱۹۱۰ء کو ایک خبر شائع کی کہ شیخ یعقوب علی تراب کی نواسی کا نکاح بعد از نماز مغرب پانچ سو حق مہر پر ڈاکٹر محمد اقبال سے ہوا۔ اس پر محبان اقبال کو بہت صدمہ ہوا کہ انھوں نے کیوں کسی قادیانی سے ناطہ جوڑا ہے۔ اس پر اقبال نے فوراً تردیدی بیان شائع کروایا جو "پیسہ اخبار" مورخہ ۱۵ ستمبر ۱۹۱۰ء میں شائع ہوا!

"اس عبارت سے میرے اکثر احباب کو غلط فہمی ہوئی اور انھوں نے مجھ سے زبانی اور بذریعہ خطوط استفسار کیا ہے۔ سب حضرات کی آگاہی کے لیے بذریعہ آپکے اخبار کے اس امر کا اعلان کرتا ہوں کہ مجھے اس معاملے سے کچھ سروکار نہیں ہے۔ جن ڈاکٹر صاحب کا ذکر ایڈیٹر صاحب "الحکم" نے کیا ہے وہ کوئی اور صاحب ہوں گے۔" (معاصرین اقبال کی نظر میں، مرتبہ: محمد عبداللہ قریشی)

"خطوط اقبال" کے مرتب رفیع الدین ہاشمی کے مطابق احمد یہ اخبار "الفضل" نے لاہوری قادیانی گروہی جھگڑے میں علامہ اقبال سے منسوب یہ بیان کہ عقائد کے لحاظ سے قادیان والے سچے ہیں مگر مجھے لاہور والوں سے ہمدردی ہے۔ مورخہ ۱۹ اکتوبر، ۱۹۱۵ء کو شائع کیا۔ اس کی تردید علامہ اقبال نے جاری کی جو پیغام صلح مورخہ ۱۵ نومبر ۱۹۱۵ء میں شائع ہوئی۔ ملاحظہ ہو!

"اختلاف سلسلہ احمدیہ کے متعلق وہی شخص رائے دے سکتا ہے جو مرزا صاحب مرحوم کی تصانیف سے پوری آگاہی رکھتا ہو اور یہ آگاہی مجھے حاصل نہیں ہے۔ اسکے علاوہ یہ بات بدیہی ہے کہ غیر احمدی مسلمان جو رسول اللہ ﷺ کے بعد کسی نبی کے آنے کا قائل نہ ہو وہ کس طرح یہ بات کہہ سکتا ہے کہ عقائد کے لحاظ سے قادیان والے سچے ہیں۔" (خطوط اقبال، مرتبہ رفیع الدین ہاشمی: بحوالہ زندہ رود، صفحہ نمبر: ۶۲۸)

۱۹۱۶ء میں جب قادیانیوں کی طرف سے مرزا قادیانی کی نبوت پر ایمان نہ لانے والوں کے کافر ہونے کا اعلان کیا تو تب بھی حکیم الامت علامہ اقبال خاموش نہ رہے بلکہ انھوں نے اپنا بیان اس طرح جاری کیا!

"جو شخص نبی کریم ﷺ کے بعد کسی ایسے نبی کا قائل ہو چکا ہے جس کا انکار مستلزم کفر ہو وہ اسلام سے خارج ہے۔" (گفتار اقبال، صفحہ نمبر: ۲۲ مرتبہ محمد رفیق افضل)

مندرجہ بالا تمام اقتباسات سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ علامہ اقبال اچانک حادثاتی طور پر قادیانیوں کے خلاف

نہیں ہوئے بلکہ شروع سے راسخ العقیدہ مسلمان تھے۔اس سلسلہ میں انکے خلاف اڑائی گئی ساری دھول اس آخری اقتباس سے چھٹ جائے گی جس میں انھوں نے اپنے مذہبی عقائد کا اظہار کیا ہے۔یہ انکی خصوصی تحریر ہے جوانھوں نے اپنے بیٹے جاوید اقبال کے نام اپنی یادداشت کی کتاب میں ۱۷، اکتوبر ۱۹۳۵ء میں لکھی۔اس میں جاوید اقبال کو چند نصیحتوں کے بعد لکھا!

> ''باقی دینی معاملات میں میں صرف اس قدر کہنا چاہتا ہوں کہ میں اپنے عقائد میں بعض جزوی مسائل کے سوا جو ارکان دین میں سے نہیں ہیں، سلف صالحین کا پیرو ہوں اور یہی راہ بعد کامل تحقیق کے محفوظ معلوم ہوتی ہے۔جاوید کو بھی میرا یہی مشورہ ہے کہ وہ اس راہ پر گامزن رہے اور اس بدقسمت ملک ہندوستان میں مسلمانوں کی غلامی نے جو دینی عقائد کے نئے فرقے مختص کر لیے ہیں، ان سے احتراز کرے۔بعض فرقوں کی طرف لوگ محض اس لیے مائل ہوتے ہیں کہ ان فرقوں کے ساتھ تعلق قائم کرنے سے دنیوی فائدہ ہے۔ میرے خیال میں بڑا بدبخت ہے وہ انسان جو صحیح دینی عقائد کو مادی منافع کی خاطر قربان کردے۔غرض یہ ہے کہ طریقہ حضرات اہل سنت محفوظ ہے اور اسی پر گامزن رہنا چاہیے اور ائمہ اہل بیعت کے ساتھ محبت اور عقیدت رکھنی چاہیے۔''(زندہ رود، صفحہ نمبر:۷۱۷)

کیا اپنے لخت جگر، نور نظر جاوید اقبال کے نام اس وصیتی تحریر کے بعد بھی کوئی سوچ سکتا ہے کہ علامہ اقبال کا قادیانیت سے کوئی بھی علاقہ ہوسکتا تھا۔

(علامہ اقبال سے قادیانیوں کی مخاصمت)

یہ بات تو اظہر من الشمس ہے کہ حکیم الامت علامہ اقبال کبھی بھی ملت ضالہ قادیانیہ میں شامل نہیں رہے اور شروع ہی سے عقیدہ ختم نبوت پر اپنے غیر متزلزل ایمان کا مسلسل اظہار کرتے رہے تھے۔تاہم یہ بات بھی صحیح ہے کہ انھوں نے اس شدومد سے قادیانیت کی پہلے مخالفت نہیں کی جس شدت سے انھوں نے ۱۹۳۵ء میں انکی مخالفت فرمائی۔اور اس معاملے میں وہ تنہا نہیں ہیں ہندوستان کے بہت سے علماء بھی شروع شروع میں مرزا قادیانی خلاف نہیں تھے تا آنکہ اس نے مجددیت اور محدثیت سے بڑھ کر مہدی اور مسیح موعود کے بعد نبی ہونے کا دعویٰ کردیا۔تب ہی علماء مرزا کے خلاف صف آراء ہوئے۔اوائل میں قادیانیوں کے خلاف محاذ آرائی نہ کرنے کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ مذہبی جماعتوں کے افکار و نظریات اور انکی تصحیح و تغلیط حضرت اقبال کا میدان فکر نہ تھا۔وہ دنیا بھر کے مسلمانوں میں بالعموم اور ہندوستانی مسلمانوں میں بالخصوص ایک نئی روح پھونکنا چاہتے تھے۔اسلامی دنیا پہ چھائی غلامی کی سیاہ رات کا خاتمہ چاہتے تھے۔منتشر امت مسلمہ کی شیرازہ بندی کے ذریعے

اسلام کی نشاۃ ثانیہ کے آرزومند تھے۔اسلیے فرقہ وارانہ مناظروں اور مسلکی بحثوں سے وہ الگ ہی رہے۔ملت میں سیاسی سماجی اور روحانی بنیادوں پر ایک انقلاب برپا کرنا ان کا مطمع نظر تھا۔اسی لیے انھوں نے ختم نبوت کے متعلق اپنے عقیدے کا برملا اظہار تو کیا مگر مرزا قادیانی کے خلاف کوئی تحریری محاذ نہ کھولا۔ویسے بھی شروع شروع میں مرزا کا تعارف ایک اسلامی سکالر اور عیسائی مشنریوں کے خلاف ایک پرجوش مناظر کا تھا۔اسی وجہ سے علماء کو بھی اسے سمجھنے میں دیر لگی۔اسکی موت کے بعد ۱۹۱۹ء تک بھی اقبال اعتراف کرتے ہیں کہ انھیں مرزا کی ساری تصانیف اور آراء سے آگاہی حاصل نہیں ہے۔اسی لیے اس ابتدائی دور میں انھوں نے مرزا قادیانی یا قادیانی جماعت کے بارے میں کوئی اچھے جملے کہے تو اس پر انھیں مطعون نہیں کیا جاسکتا۔

حیرت ہے کہ مرزائی امت کا خلیفہ ثانی مرزا بشیر الدین محمود ایک طرف اپنی تصنیف ”سیرت مہدی“ میں اعتراف کرتا ہے کہ اقبال نے اپنے لڑکپن ہی میں اپنے والد شیخ نور محمد کو ورغلا کر احمدیت سے برگشتہ کردیا تھا اور مرزا قادیانی نے شیخ نور محمد کو اپنی جماعت اور دائرہ اسلام سے خارج کردیا تھا اور دوسری طرف وہ تاریخ احمدیت کی آٹھویں جلد میں صفحہ نمبر:۱۸۸ پر لکھتا ہے:!

”سرمحمد اقبال کو کچھ عرصے سے میری ذات اور جماعت احمدیہ سے عموماً بغض پیدا ہوگیا ہے۔اور اب انکی حالت یہ ہے کہ یا تو کبھی وہ انہی عقائد کی موجودگی میں جو ہماری جماعت کے اب بھی ہیں جماعت احمدیہ سے تعلق موانست اور مواخات رکھنا برا نہیں سمجھتے یا اب کچھ عرصہ سے وہ اسکے خلاف خلوت وجلوت میں آواز اٹھاتے رہتے ہیں۔میں ان وجوہات کے اظہار کی ضرورت محسوس نہیں کرتا جو اس تبدیلی کا سبب ہوئے ہیں۔ ۱۹۱۱ء میں اقبال علی گڑھ میں مسلمان طلباء کو تعلیم دے رہا تھا کہ پنجاب میں اسلامی سیرت کا ٹھیٹھ نمونہ اس جماعت کی شکل میں ظاہر ہوا ہے جسے فرقہ قادیانی کہا جاتا ہے۔ ۱۹۳۵ء میں ایک دوسرے اقبال کی صورت میں بدل دیا جو یہ کہہ رہا ہے کہ ”میرے نزدیک قادیانیت سے بہائیت زیادہ ایماندار ہے کیونکہ بہائیت نے اسلام سے اپنی علیحدگی کا اعلان واشگاف طور پر کردیا لیکن قادیانیت نے اپنے چہرے سے منافقت کا نقاب الٹ دینے کی بجائے اپنے آپ کو محض نمائشی طور پر جزو اسلام قرار دیا اور باطنی طور پر اسلام کی روح کے تخیل کو تباہ و برباد کرنے کی پوری کوشش کی۔“

تعجب ہے کہ تضاد تو خود مرزا بشیر الدین کے بیانات میں ہے مگر تضاد بیانی کا الزام علامہ اقبال کے سر دھر دیا ہے۔حالانکہ اگر علامہ اقبال کی تحریر کو سیاق وسباق سمیت دیکھا جائے تو اسکا وہ مطلب نہیں جو مرزا بشیر الدین نے لیا ہے۔دراصل سیرت کے ٹھیٹھ نمونے والی عبارت علامہ اقبال کی ایک ترجمہ شدہ کتاب ”ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر“ سے لی گئی ہے۔اقبال کا اصل جملہ انگلش میں یوں ہے۔

In the punjab the initially muslim type of character has found a powerfull expression in the so called Qadiani sect.

اس جملے میں ترجمہ نگاروں نے سہواً **so called** کا ترجمہ نہ کیا وگرنہ اسے نام نہاد قادیانی فرقہ لکھا اور پڑھا جاتا تو اقبال کی اصل عبارت کا مفہوم سمجھ آجاتا۔ تاہم انکی ابتدائی دور کی ان ایک دو تحریروں اور تقریروں پر اقبال کی زندگی ہی میں انھیں سامنا کرنا پڑا۔ ۱۹۳۵ء میں ایک قادیانی ہفتہ وار "لائٹ" کے نمائندے نے اقبال کا انٹرویو لیا اور ایک اور قادیانی ہفتہ وار "سن رائز" کے مطابق انکی طرف سے مرزائیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیئے جانے کے مطالبے پر اعتراض کرتے ہوئے انکی انھی پرانی تحریروں اور تقریروں کا حوالہ دیا تو علامہ اقبال نے جواباً فرمایا!

> "یہ تقریر میں نے ۱۹۱۱ء یا اس سے قبل کی تھی اور مجھے یہ تسلیم کرنے میں کوئی باک نہیں کہ اب سے ربع صدی پیشتر مجھے اس تحریک سے اچھے نتائج کی امید تھی۔ کسی مذہبی تحریک کی اصل روح ایک دن میں نمایاں نہیں ہو جاتی۔ اسے اچھی طرح ظاہر ہونے کے لیے برسوں چاہئیں۔ ذاتی طور پر میں اس تحریک سے اس وقت بیزار ہوا تھا جب ایک نئی نبوت نے بانی اسلام کی نبوت سے برتر ہونے کا حتمی طور پر دعویٰ کیا۔ اور تمام مسلمانوں کو کافر قرار دے دیا۔ بعد میں یہ بیزاری بغاوت کی حد تک پہنچ گئی جب میں نے تحریک کے ایک رکن کو اپنے کانوں سے آنحضرت ﷺ کے متعلق نازیبا کلمات کہتے سنا، درخت جڑ سے نہیں پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ اگر میرے موجودہ رویہ میں کچھ تناقص ہے تو یہ بھی ایک زندہ اور سوچنے والے انسان کا حق ہے کہ وہ اپنی رائے بدل سکے۔ بقول ایمرسن (صرف پتھر اپنے آپ کو نہیں جھٹلا سکتے۔)" (کتابچہ احمدیت، اسلام اور ختم نبوت، ادارہ طلوع اسلام مطبوعہ ۱۹۵۴ء)

مرزا بشیر الدین محمود نے تو وہ وجوہات بیان کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی جن کے باعث علامہ اقبال نے قادیانیوں کے بارے میں اپنی رائے تبدیل کی لیکن "مظلوم اقبال" کے مصنف اور اقبال کے قادیانی بھتیجے شیخ اعجاز احمد اسے مجلس احرار کا فتنہ سمجھتے ہیں۔ جس نے کشمیر کمیٹی کے قیام کے دوران اقبال اور جماعت احمدیہ کے تعاون میں رخنہ ڈالا (زندہ رود، صفحہ نمبر:۶۴۱) ڈاکٹر جاوید اقبال نے شیخ اعجاز احمد کے اس مؤقف کے ردّ میں وضاحت فرماتے ہوئے لکھا کہ "اقبال اور مجلس احرار کے نظریات میں ہمیشہ فرق رہا۔ مجلس احرار خلافت کمیٹی کی کوکھ سے نکلی تھی اور نظریات کے اعتبار سے جمعیت علماء ہند کی طرح نیشنلسٹ مسلمانوں کی جماعت اور کانگرس کی ہمنوا تھی۔ احراری قائدین نے عام طور پر اقبال اوران کے نظریات کی مخالفت کی

.....اقبال نے جس طرح تحریک احمدیہ کے خلاف اپنے خیالات کا برملا اظہار کیا اسی طرح مولانا حسین احمد مدنی کے نظریہ قومیت کے خلاف اظہار رائے کرتے ہوئے کمال جرأت اور بے باکی سے فرمایا!

''حقیقت یہ ہے کہ مولانا حسین احمد مدنی اور انکے ہم خیال قومیت کے بارے میں جو نظریہ رکھتے ہیں وہ ایک لحاظ سے اسی طرح ہے جو رسول اللہ ﷺ کے خاتم النبیین ہونے سے انکار کرنے میں قادیانیوں کا ہے۔ دوسرے الفاظ میں قومیت کے علم بردار یہ چاہتے ہیں کہ موجودہ زمانے کی ضرورت کے پیش نظر مسلمانوں کو ہر زمان و مکاں کے لیے قانون الٰہی کے ساتھ نئی پوزیشن اختیار کرنی چاہیے۔ جس طرح قادیانی ایک نئی نبوت کی اختراع سے قادیانیوں کو فکر و نظر کی ایک نئی راہ اختیار کرنے کو کہتے ہیں۔ جس سے بالآخر حضرت محمد ﷺ کے خاتم المرسلین ہونے سے انکار کی منزل آجاتی ہے۔ بظاہر قومیت کا یہ تصور ایک سیاسی نظریہ ہے اور حضرت محمد ﷺ کے خاتم النبیین ہونے سے قادیانیوں کا انکار ایک دینی مسئلہ ہے لیکن ان دونوں کے درمیان ایک گہرا داخلی تعلق ہے جس کو واضح طور پر اس وقت پیش کیا جا سکے گا جب کوئی خداداد بصیرت سے بہرہ ور مسلمان مؤرخ ہندوستانی مسلمانوں کی تاریخ مرتب کرے گا۔ اور اس میں بظاہر جاندار فرقوں کے مذہبی فکر کو خاص طور پر پیش نظر رکھے گا۔''(اقبال کی تقریریں اور بیانات، مرتبہ اے آر طارق، صفحہ نمبر:۱۰۱)

سوچنے کی بات ہے اگر اقبال کو مجلس احرار یا کانگریس کے ہم نوا علماء سے ذرا بھی ہمدردی اور تعلق خاطر ہوتا تو وہ مولانا حسین احمد مدنی کے خلاف اپنے درج ذیل شہرہ آفاق اشعار سید نذیر نیازی کو بیاض میں درج کرنے اور ارمغان حجاز میں شامل کرنے کا حکم نہ فرماتے۔

عجم ہنوز نداند رموز دیں ورنہ	ز دیوبند حسین احمد ایں چہ بوالعجبی است
سرود بر سر منبر کہ ملت از وطن است	چہ بے خبر ز مقام محمد ﷺ عربی است
بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست	اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

محولہ بالا عبارت میں علامہ اقبال نے کانگریسی علماء اور قادیانیوں کے درمیان جس گہرے داخلی تعلق کا ذکر کیا ہے وہ ذرا سی تحقیق سے سامنے آجاتا ہے۔ مجلس احرار اور جمعیت علماء ہند کی کانگریس نوازی تو کسی سے ڈھکی چھپی نہیں ہے لیکن قادیانی بھی اس میدان میں ان سے پیچھے نہیں تھے۔ جمعیت علماء ہند والے بھی پنڈت نہرو کو اپنے اجتماعات میں بلاتے تھے اور قادیانی بھی اس معرکے میں ان سے پیچھے نہیں تھے۔ قادیان کے اخبار ''الفضل'' کی مؤرخہ ۳۱ مئی ۱۹۳۶ء کی اشاعت میں ۲۸ مئی ۱۹۳۶ء کو لاہور میں پنڈت نہرو کے زبردست استقبال کی خبر شائع کی گئی جس کے مطابق قادیانیوں کے سیاسی شعبے نیشنل لیگ کور کے پانچ سو سے زائد رضاکاروں نے فخر قوم اور فخر وطن کے القابات سے نوازتے ہوئے پنڈت نہرو کا استقبال کیا اور اسکے حق میں زبردست نعرہ بازی کی۔ اس سے کانگریس سے قادیانی جماعت کے تعلق کو بخوبی سمجھا جاسکتا ہے۔ پنجاب کے

یونینسٹ لیڈر سر فضل حسین کی ڈائری مرتبہ ڈاکٹر وحید احمد سے بھی کانگریس قادیانی اتحاد کی تفصیلات دیکھی جا سکتی ہیں۔ جس کے مطابق قادیانیوں نے سر فضل حسین کی جماعت کو کامیاب کرانے کے لیے بے تحاشہ پیسہ خرچ کیا۔ انگریز بھی یونینسٹ پارٹی کی سرپرستی کر رہا تھا، قادیانی رقم لگا رہے تھے۔ کانگریس نے بھی کانگریسی مسلمان امیدوار کھڑے کیے ہوئے تھے۔ ان حالات میں مسلم لیگ کو شکست کا سامنا کرنا پڑا۔ کانگریس کی فتح اور مسلم لیگ کی شکست پر قادیانیوں نے جشن فتح منایا۔ ''فاروق قادیان'' ۱۱ نومبر ۱۹۳۸ء کی اشاعت میں مرزا بشیر الدین محمود کا بیان اس حقیقت کی نشاندہی کرنے کے لیے کافی ہے!

> ''اس میں کوئی شک نہیں کہ ہم نے مسلم لیگ کی مخالفت کی ہے کیونکہ مسلم لیگ جو میری مالی امداد کے بغیر جلسہ تک نہیں کر سکتی تھی اس کی پنجاب شاخ نے قادیانیوں کو مسلم لیگ سے خارج کرنے کی سفارش کی تھی۔ پنجاب کے مسلم لیگیوں نے یہ سوچا تھا کہ اس طرح پنجاب میں ووٹوں کی اکثریت حاصل کر لیں گے۔ لیکن خدا نے انھیں اس غلط فیصلے کی سخت سزا دی کہ پورے پنجاب میں مسلم لیگ نے صرف ایک سیٹ حاصل کی۔ دوسرے لفظوں میں وہ سیاسی میدان میں ہمارے جیسے ثابت ہوئے چنانچہ مسلم لیگ کی یہ ذلت آمیز شکست ہماری بہت بڑی کامیابی ہے۔'' (فاروق قادیان، ۱۱ نومبر ۱۹۳۸ء)

قضیہ کشمیر کمیٹی:

اقبال ختم نبوت کے بارے میں اپنے عقیدے کا اظہار تو ہمیشہ کرتے رہتے تھے مگر انھوں نے کبھی قادیانیوں کے خلاف بحیثیت جماعت کوئی معاندانہ بیان نہیں دیا تھا۔ اسکی ضرورت اس وقت پیش آئی جب انھیں کشمیر کمیٹی میں قادیانیوں کے ساتھ مل کر کام کرنے کا موقع ملا۔ قادیانی خلیفہ اور اسکے حواریوں کی منافقت، مفاد پرستی اور سیاسی چالبازیوں کی پالیسیوں نے اقبال کو ان سے اس قدر متنفر کیا کہ وہ کھل کر قادیانیوں کی ریشہ دوانیوں کو بے نقاب کرنے کے لیے میدان عمل میں اتر آئے۔ یہی بات قادیانی امت کو ناگوار گزری اور وہ اقبال کے خلاف صف آراء ہوگئی۔ تفصیل اس جمال کی یہ ہے کہ جموں جیل میں توہین قرآن کا ایک افسوس ناک واقعہ پیش آیا تو کشمیری عوام سراپا احتجاج بن گئے۔ اس حادثہ کی مذمت پر احتجاجی جلسہ ہو رہا تھا جس میں ایک عبدالقدیر نامی مقرر نے سخت اشتعال انگیز تقریر کر ڈالی۔ اسے گرفتار کر لیا گیا۔ اس کے مقدمے کی سماعت جیل کے اندر ہو رہی تھی اور عوام جیل کے سامنے جمع ہو رہے تھے۔ ایسے میں پولیس نے ۱۳ جولائی ۱۹۳۱ء کو گولی چلا کر ۱۸ مسلمانوں کو شہید کر دیا۔ جس سے کشمیری مسلمانوں میں غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ بعد ازاں تحقیق سے معلوم ہوا کہ عبدالقدیر نامی شخص کشمیری بھی نہیں تھا، وہ قادیانی اور انگریزوں کا ایجنٹ تھا اور انہی کے منصوبے پر کام کر رہا تھا۔ اور دوسرے یہ کہ احتجاج کرنے والے

مظاہرین پر گولی چلانے کا حکم بھی ڈوگرہ حکام نے نہیں دیا تھا۔ یہ کارنامہ بھی انگریزوں کی سی آئی ڈی کے لیے کام کرنے والے چند سپاہیوں نے انگریز حکام کے ایما پر ہی سرانجام دیا تھا۔ جب لوہا گرم ہو گیا تو کشمیر کی وادی ایک زبردست عوامی تحریک کے لیے تیار ہو گئی تو مرزا بشیر الدین محمود نے انگریزوں سے اپنی طے شدہ سازش کے تحت گرم لوہے پر چوٹ لگانے کا فیصلہ کیا۔ عامتہ المسلمین کے گرم گرم جذبات سے فائدہ اٹھانے کے لیے مسلمان زعما کا ایک اجلاس طلب کیا تا کہ کشمیری مسلمانوں کی مدد کی جا سکے۔ چونکہ اجلاس خود مرزا بشیر الدین محمود نے ہی طلب کیا تھا اسلیے سرکار نے مرزا محمود ہی کو اس وقت تشکیل پانے والی کشمیر کمیٹی کا صدر اور ایک قادیانی عبدالرحیم درد کو سیکرٹری منتخب کر لیا۔ علامہ اقبال بھی اس کمیٹی کے ممبر تھے۔ کمیٹی چونکہ عارضی طور پر بنائی گئی تھی خیال تھا کہ کشمیری مسلمانوں کا مسئلہ حل کرنے کے بعد اسے توڑ دیا جائے گا۔ اس لیے اس کوئی باقاعدہ دستور نہیں بنایا گیا۔ صدر کشمیر کمیٹی مرزا بشیر الدین محمود ہی تمام اختیارات کا مالک تھا اور اس نے اپنے قادیانی ارکان کے ذریعے وادیٔ کشمیر میں کشمیری مسلمانوں کی حمایت اور مدد کے بہانے اپنے نظریات پھیلانے کا کام شروع کر دیا۔ جس پر غیر قادیانی ارکان کو بجا طور پر شکایت ہوئی جن میں اقبال بھی شامل تھے۔ چنانچہ ان سب نے مل کر تجویز پیش کی کہ کشمیر کمیٹی کا کوئی دستور بنایا جائے۔ یہ بات قادیانی ارکان کو اچھی نہ لگی اور یوں مرزا بشیر الدین محمود نے کشمیر کمیٹی کی صدارت سے استعفٰی دے دیا۔ ارکان نے علامہ اقبال کو صدر چن لیا جبکہ قادیانیوں نے اپنی الگ تنظیم تحریکِ کشمیر قائم کر لی۔ قادیانی ممبر بدستور کشمیر کمیٹی میں گھسے رہے اور تخریب کاری کرتے رہے۔ علامہ اقبال کو انکا یہ طریقہ بالکل اچھا نہیں لگا اور انھوں نے کمیٹی سے استعفٰی دے دیا اور اپنے بیان میں وضاحت کرتے ہوئے کہا!

> ''بدقسمتی سے کمیٹی میں بعض ارکان کسی وفاداری کے پابند نہیں سوائے اپنے مذہب فرقے کے امیر کے ساتھ وفاداری کے۔ اس کی وضاحت حال ہی میں ایک احمدی وکیل نے اپنے پبلک بیان میں کر دی ہے۔ جو میر پور میں لوگوں کے کیس کر رہا تھا۔ اس نے صاف اعتراف کیا ہے کہ وہ کشمیر کمیٹی کو تسلیم نہیں کرتا اور وہ یا اس کے ساتھی جو کچھ بھی کرتے ہیں صرف اپنے امیر کے حکم پر کرتے ہیں۔ بہر کیف اگر مسلمانانِ ہند اپنے کشمیری بھائیوں کی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ایک اور کشمیر کمیٹی بنا سکتے ہیں۔'' (اقبال کی تقریریں، تحریریں اور بیانات: مرتبہ لطیف احمد شیروانی)

قادیانیوں نے تحریک کشمیر بنا کر اقبال کو اس کی صدارت سنبھالنے کی پیش کی تو اقبال نے اپنے بیان میں کہا!

> ''قادیانی ہیڈ کوارٹر کی طرف سے ابھی تک ایسا کوئی واضح بیان نہیں جاری ہوا کہ اگر قادیانی حضرات مسلمانوں کی سیاسی تنظیم میں شامل ہوں گے تو ان کی وفاداریاں منقسم نہ ہوں گی۔

دوسری طرف واقعاتی طور پر یہ ظاہر ہوگیا ہے کہ جسے قادیانی پریس "تحریک کشمیر" کے نام سے پکارتا ہے اور جس میں بقول قادیانی اخبار "الفضل" مسلمانوں کو محض اخلاقی طور پر شامل ہونے کی اجازت دی گئی ہے، ایک ایسی تنظیم جسکے مقاصد ومحرکات آل انڈیا کشمیر کمیٹی سے مختلف ہیں۔" (اقبال کی تقریریں، تحریریں اور بیانات: مرتبہ لطیف احمد شیروانی)

بعدازاں اقبال نے آل انڈیا کشمیر کمیٹی کی صدارت سے بھی استعفیٰ دے دیا۔ انہی دنوں اس وقت کے گورنر پنجاب سر ہربرٹ ایمرسن نے انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے سے خطاب کیا اور اس میں قادیانیوں کے خلاف مسلمانوں کے احتجاج کا ذکر کرتے ہوئے انھیں رواداری کا سبق دیا۔ انگریز گورنر نے نہ صرف قادیانیوں کے خلاف مظاہروں پر ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے مسلمانوں کو رواداری کی تلقین کی بلکہ مسلمانوں کے باہمی نفاق پر افسوس کا اظہار کرتے ہوئے مسلمانان پنجاب کو مشورہ دیا کہ وہ اپنی قوم میں کوئی بلند پایہ لیڈر پیدا کریں۔ اقبال نے گورنر ایمرسن کے خطاب کے جواب میں "قادیانیت اور صحیح العقیدہ مسلمان" پہلا مضمون لکھا جو ایسٹرن ٹائمز، ٹریبون، سٹار آف انڈیا، کلکتہ، دکن ٹائمز وغیرہ انگلش اخباروں میں چھپا۔ اردو اخباروں میں ترجمہ شائع ہوا۔ اس مضمون کا خلاصہ ڈاکٹر جاوید اقبال نے "زندہ رود" میں اپنے الفاظ میں یوں کیا!

"قادیانیت اور صحیح العقیدہ مسلمان میں مختصراً اقبال کا استدلال یہ تھا کہ مسلمانوں کی ملی وحدت کی بنیادیں مذہبی تصور پر ہیں۔ اگر ان میں کوئی گروہ ایسا پیدا ہو جو اپنی اساس ایک نئی نبوت پر رکھتے ہوئے یہ اعلان کرے کہ تمام مسلمان جو اس کا مؤقف قبول نہیں کرتے وہ کافر ہیں تو قدرتی طور پر ہر مسلمان ایسے گروہ کو ملت اسلامیہ کے استحکام کے لیے ایک خطرہ قرار دے گا۔ اور یہ بات اس لیے بھی جائز ہوگی کہ مسلم معاشرے کو ختم نبوت کا عقیدہ ہی سالمیت کا تحفظ فراہم کرتا ہے۔ اقبال کے نزدیک قبل از اسلام مجوسیت کے جدید احیاء نے جن دو تحریکوں کو جنم دیا ان میں ایک بہائیت ہے اور دوسری قادیانیت۔ بہائیت اس اعتبار سے زیادہ دیانت پر مبنی ہے کہ وہ اسلام سے علیحدگی کا راستہ اختیار کرتی ہے۔ لیکن قادیانیت اسلام کے بعض اہم ظواہر کو برقرار رکھتے ہوئے اسکی روح اور نصب العین سے انحراف کرتی ہے۔ اقبال کے بیان کے مطابق "بروز"، "حلول" اور "ظل" کی اصطلاحات مسلم ایران میں منحرف تحریکوں نے اختیار کیں۔ اور مسیح موعود کی اصطلاح بھی مسلم دینی شعور کی تخلیق نہیں ہے۔ آخر میں فرماتے ہیں کہ ہندوستان کے حاکموں کے لیے بہترین راستہ یہی ہے کہ قادیانیوں کو ایک علیحدہ مذہبی فرقہ قرار دیں۔" (زندہ رود، صفحہ نمبر: ۶۱۰)

علامہ اقبال کے مضمون "قادیانیت اور صحیح العقیدہ مسلمان" کا خلاصہ پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر جاوید اقبال نے ایک اہم بات کا ذکر نہیں کیا۔ جس میں عام مسلمانوں کی سمجھداری اور نام نہاد تعلیم یافتہ طبقہ کی کج فہمی کا ذکر ہے۔ آج تک پڑھے لکھے حضرات ذوالفقار علی بھٹو کی طرف قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیے جانے کے فیصلے پر پیچ و تاب کھاتے ہیں کہ یہ اقدام بھٹو مرحوم نے مذہبی جماعتوں اور علماء کے پریشر میں آ کر کیا تھا۔ اس سلسلہ میں خود ڈاکٹر جاوید اقبال کے بیانات بھی حیران کن اور محل غور ہیں!

> "ہم پاکستان میں یہ بحث نہیں کرنا چاہتے کہ کوئی صحیح مسلمان ہے یا نہیں۔ ہمارا مسئلہ ہماری قومیت کو قائم دائم رکھنا تھا۔ لیکن آپ دیکھیں کہ بھٹو جیسا شخص مولویوں کے دباؤ میں ایک کیمونٹی کو اقلیتی کیمونٹی قرار دیتا ہے۔ میری نگاہ میں یہ مسئلہ نہیں ہے کہ قادیانی مسلمان ہیں یا نہیں بلکہ ملکی سالمیت کا مسئلہ ہے۔" (انٹرویو ڈاکٹر جاوید اقبال، روزنامہ خبریں: ۱۸ اگست ۱۹۹۷ء)

اسی طرح روزنامہ جنگ لاہور ۱۳ اگست ۱۹۹۴ء کی اشاعت کے مطابق ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب ان الفاظ میں قادیانیوں کی حمایت کر چکے ہیں!

> "قائداعظم زندہ ہوتے تو قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار نہ دیتے، ان کی وزارت میں ظفر اللہ خان قادیانی شامل تھا۔"

قیاللعجب! ناطقہ سر بگریباں ہے اسے کیا کہیے۔ زندہ رود میں ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب نے خود ہی علامہ اقبال کی طرف سے قادیانیوں کے غیر مسلم قرار دیے جانے کے مطالبے کا ذکر کیا ہے اور اب خود ہی اس مطالبے کو مولویوں کا پریشر فرما رہے ہیں۔ خیر اس جملہ معترضہ کا مقصد ڈاکٹر جاوید اقبال صاحب کی مذمت کرنا نہیں بلکہ اس حقیقت کی نشاندہی کرنا ہے کہ مغربی تعلیم یافتہ طبقے نے قادیانی مسئلہ کو سمجھنے میں جو ٹھوکر کھائی تھی آج تک وہی ٹھوکر کھاتا چلا آ رہا ہے۔ اور اسے اسلام کا بنیادی مسئلہ سمجھنے کی بجائے محض مولویوں کی نادانی اور ہٹ دھرمی کا شاخسانہ سمجھ رہا ہے۔ علامہ اقبال نے کس قدر صحیح گرفت فرمائی تھی ملاحظہ ہو!

> "ہندی مسلمانوں نے قادیانی تحریک کے خلاف جس شدت احساس کا ثبوت دیا ہے وہ اجتماعیات کے طالبعلم پر واضح ہے۔ عام مسلمان جسے پچھلے دنوں سول اینڈ ملٹری گزٹ کے ایک صاحب نے ملا زادہ کا خطاب دیا تھا۔ اس تحریک کے مقابلے میں حفظ نفس کا ثبوت دے رہا ہے۔ اگرچہ اسے ختم نبوت کے عقیدہ کی پوری سمجھ نہیں۔ نام نہاد تعلیم یافتہ مسلمانوں نے ختم نبوت کے تمدنی پہلو پر کبھی غور نہیں کیا۔ اور مغرب کی ہوا نے انھیں حفظ نفس کے جذبے سے عاری کر دیا ہے۔ بعض ایسے ہی نام نہاد تعلیم یافتہ مسلمانوں نے اپنے مسلمان

بھائیوں کو رواداری کا مشورہ دیا ہے۔" (اقبال کی تقریریں اور بیانات : مرتبہ، اے آر طارق)

خیر یہ اقتباس تو اس لیے پیش کیا گیا کہ آج کا پڑھا لکھا اور اپنے آپ کو عبقری سمجھنے والا لبرل مسلمانوں کا طبقہ سمجھے کہ قادیانیوں کو صرف مسجد کے ملا ہی غیر مسلم نہیں سمجھتے مغربی تعلیم یافتہ اور جدید افکار پر نظر رکھنے والے حضرت اقبال کا بھی یہی مؤقف تھا کہ قادیانی عام مسلمانوں سے الگ غیر مسلم اقلیت ہیں۔ اور انھوں نے انگریز حکومت سے انھیں غیر مسلم قرار دینے کا مطالبہ بھی کیا تھا۔ علامہ اقبال کے اس مضمون پر پورا قادیانی پریس چیخ پڑا تھا۔ لائٹ اور سن رائز جیسے قادیانی ہفت روزوں نے اقبال کے خلاف خوب کھل کر تنقید کی۔ سن رائز کے نمائندے کے اعتراض کے جواب میں علامہ اقبال نے جو کچھ کہا اس کا بھی اس مضمون میں پہلے ذکر گزر چکا ہے۔ اسی طرح "اسٹیٹسمین" نے بھی اپنے لیڈنگ آرٹیکل میں قادیانیوں کو مسلمانوں سے علیحدہ اقلیت قرار دینے کے مطالبے پر شدید اعتراض کیا۔ علامہ اقبال نے اس لیڈنگ آرٹیکل کا بھی جواب دیا اور اپنے مطالبے کی وضاحت کرتے ہوئے فرمایا!

> "جو سوال آپ نے اپنے مضمون میں اٹھایا ہے وہ فی الواقع بہت اہم ہے اور مجھے مسرت ہے کہ آپ نے سوال کی اہمیت کو محسوس کیا...... میں نے اپنے بیان میں اسے نظر انداز کر دیا تھا کیونکہ میں یہ سمجھتا تھا کہ قادیانیوں کی تفریق کی پالیسی کے پیش نظر جو انھوں نے مذہبی اور معاشرتی معاملات میں ایک نئی نبوت کا اعلان کر کے کی ہے، خود حکومت کا فرض ہے کہ قادیانیوں اور مسلمانوں کے درمیان اختلاف کا لحاظ رکھتے ہوئے آئینی اقدام اٹھائے اور اس کا انتظار نہ کرے کہ مسلمان کب مطالبہ کرتے ہیں۔ مجھے اس احساس میں سکھوں کے متعلق رویے سے بھی تقویت ملی جو سکھ ۱۹۱۹ء کے بعد آئینی طور پر علیحدہ تصور کر لیے گئے۔ حالانکہ انھوں نے کوئی مطالبہ نہیں کیا تھا۔ بلکہ لاہور ہائی کورٹ نے فیصلہ کیا تھا کہ سکھ ہندو نہیں۔ اب چونکہ آپ نے یہ سوال اٹھایا ہے میں چاہتا ہوں کہ اس مسئلے کے متعلق جو برطانویوں اور مسلم دونوں کے زاویہ نگاہ سے نہایت اہم ہے چند معروضات پیش کروں ...... ہمارا ایمان ہے کہ اسلام بحیثیت دین خدا کی طرف سے ظاہر ہوا لیکن اسلام بحیثیت سوسائٹی یا ملت رسول کریم ﷺ کی ذات کا مرہون منت ہے۔ میری رائے میں قادیانیوں کے لیے دو راستے ہیں یا وہ بہائیوں کی تقلید کریں اور ختم نبوت کے اصول کو صریحاً جھٹلا دیں اور یا پھر ختم نبوت کی تاویلوں کو چھوڑ کر اس اصول کو پورے مفہوم کے ساتھ قبول

> کرلیں۔انکی جدید دلیلیں محض اس غرض سے ہیں کہ انکا شمار دائرہ اسلام میں ہوتا کہ انھیں سیاسی فائدے پہنچ سکیں۔"

اسی بیان میں علامہ اقبال نے یہ وضاحت بھی فرمائی کہ یہ مسلمان نہیں جو قادیانیوں کو اپنے سے الگ کرنا چاہتے ہیں بلکہ قادیانیوں نے خود اپنے لیے یہ راستہ اختیار کیا ہے۔ملاحظہ ہو!

> "ثانیاً ہمیں قادیانیوں کی حکمت عملی اور دنیائے اسلام سے متعلق انکے رویئے کو بھی فراموش نہیں کرنا چاہیے۔بانی تحریک نے ملت اسلامیہ کو سڑے ہوئے دودھ سے تشبیہ دی تھی اور اپنی جماعت کو تازہ دودھ سے اور اپنے پیروکاروں کو ملت اسلامیہ سے میل جول رکھنے سے علیحدہ رہنے کا حکم دیا تھا۔اسکے علاوہ انکا بنیادی اصول سے انکار جیسے اپنی جماعت کا نیا نام (احمدی) مسلمانوں کی باجماعت نماز سے قطع تعلق، نکاح وغیرہ کے معاملات میں مسلمانوں سے بائیکاٹ اور ان سب پر مستزاد اعلان یہ کہ دنیائے اسلام کافر ہے یہ تمام امور قادیانیوں کی علیحدگی پر دلالت کرتے ہیں۔"

اس بیان میں حضرت اقبال نے یہ وضاحت فرمائی کہ جب قادیانی مذہبی اور معاشرتی معاملات میں اپنے آپ کو علیحدہ گردانتے ہیں تو سیاسی طور پر مسلمانوں میں کیوں رہنے پر اصرار کرتے ہیں۔اقبال کے مطابق ابھی قادیانیوں کی تعداد محض ۵۶۰۰۰ ہے جو انھیں اسمبلی کی ایک نشست بھی نہیں دلا سکتی۔اس لیے وہ اس وقت تک علیحدگی کا مطالبہ نہیں کریں گے جب تک انکی مقدار مؤثر نہ ہو جائے۔

قارئین کرام! حضرت اقبال کا خدشہ سو فیصد درست ثابت ہوا۔قادیانیوں نے تقسیم ہند کے وقت اپنے آپ کو مسلمانوں سے علیحدہ شمار کیے جانے کا مطالبہ کر کے ضلع گورداسپور کو ہندوستان میں شامل کرنے کا راستہ ہموار کیا اور یوں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پاک بھارت کے درمیان مسئلہ کشمیر کھڑا کرنے کا بھی یہی باعث ہوا۔الغرض علامہ اقبال شرح صدر کے ساتھ سمجھ چکے تھے کہ قادیانی مسلمانوں کو نقصان پہنچا رہے ہیں اس لیے وہ اپنی شدید علالت کے باوجود بھی قادیانی سازشوں کو بے نقاب کرنے میں مصروف رہے۔جب قادیانی پریس علامہ اقبال کی ضرب مومنانہ پر چیخ چیخ کر دھائی دے رہا تھا تو پنڈت جواہر لعل نہرو کو انکا درد اٹھا اور بقول ڈاکٹر جاوید اقبال وہ بھی اس بحث میں کود پڑے۔اور انھوں نے اپنے تین انگریزی مضامین بعنوان "اتحاد اسلام" کلکتے کے رسالے ماڈرن ریویو میں نومبر ۱۹۳۵ء میں شائع کرائے اور ان میں قادیانیوں سے متعلق علامہ اقبال کے نظریات کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کی۔اقبال نے پنڈت نہرو کے مضامین کا نہایت مدلل اور جامع جواب اپنے مضمون "اسلام اور احمدیت" میں دیا جو "اسلام" مورخہ ۲۲ جنوری ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا۔

پنڈت نہرو کانگریس کے رہنما تھے اور کانگریس اکھنڈ بھارت کی علمبردار تھی اور ہندوستان کے اندر مسلمانوں کو الگ سیاسی تشخص یا خودمختاری دینے کے لیے آمادہ نہیں تھی۔اس نے بہت سے نیشنلسٹ علماء کو بھی اپنا ہمنوا بنا رکھا تھا جو اس بات کا پرچار کر رہے تھے کہ ہندوستان میں بسنے والے ہندو مسلم سکھ سب ایک قوم ہیں۔جبکہ علامہ اقبال کی قیادت میں مسلمانان ہند اب اس حقیقت کو جان رہے تھے کہ انھیں بالآخر اپنی دینی،سیاسی بقا کے لیے ہندوستان سے الگ تشخص اختیار کرنا ہوگا۔ہندو اس سوچ کو اپنے لیے ایک خطرہ سمجھتے تھے اس لیے پنڈت نہرو نے بظاہر مسلمانوں کے فائدے کے لیے "اتحاد اسلام" کے نام سے مضامین لکھے مگر ان مضامین کے مندرجات پڑھ کر یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ پنڈت نہرو کی دلچسپی اتحاد اسلام سے نہیں مسلمانوں کے سیاسی عدم استحکام سے ہے۔اسی لیے انھوں نے اقبال کی فکر کو پنجاب تک محدود قرار دیتے ہوئے بین الاقوامی مسئلہ وطنیت پر روشنی ڈالی کہ اب دنیا بھر میں وطنی قوم پرستی کا رجحان پیدا ہو رہا ہے جس سے اقبال بے خبر ہیں۔عرب دنیا میں بھی اسلام کی بجائے علاقائی قوم پرستی کی لہر دوڑ رہی ہے۔ظاہر ہے یہ بات پنڈت نہرو کے کانگریسی نکتہ نظر کی تائید کرتی تھی۔ اسلیے انھوں نے اس موقع سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے اقبال اور دیگر مسلم عمائدین کی زیر قیادت مجتمع ہوئی اسلامی سیاسی وحدت کو منتشر کرنے کے لیے قادیانیوں کی حمایت اور علامہ اقبال کی مخالفت میں مضامین لکھے۔اور ان میں دیگر سوالات کے ساتھ ساتھ یہ سوال بھی اٹھایا کہ "سرآغا خاں ہندوستانی مسلمانوں کے قائد ہیں۔کیا وہ اسلام کے تصور عقیدہ استحکام پر پورا اترتے ہیں جو اقبال پیش کر رہے ہیں؟اس طرح انھوں نے اسماعیلی جماعت کو بحیثیت مجموعی تنقید کا نشانہ بنایا۔اس سے انکا ایک مقصد تو مسلمانوں کو سرآغا خان اور انکی اسماعیلی جماعت کی مالی اور سیاسی حمایت سے محروم کرنا مقصود تھا اور دوسرے ہوسکتا ہے اسی اصول پر آگے چل کر وہ یہ سوال اٹھانا چاہتے ہوں کہ قائداعظم محمد علی جناح کا تعلق اگر اسماعیلی جماعت سے ہے تو وہ کس طرح مسلمانان ہند کے قائد ہو سکتے ہیں۔(اگرچہ مسلمان جانتے ہیں کہ حضرت قائداعظم اسماعیلی فرقے کی بجائے عام مسلمانوں کے نظریات اور عقائد اختیار کر چکے تھے)لیکن پنڈت نہرو ایک تیر سے بہت سے شکار کرنا چاہ رہے تھے۔

اپنے مضامین میں انھوں نے یہ تاثر بھی دینے کی کوشش کی کہ قادیانیوں کے خلاف مجلس احرار کی تحریک کو کانگریس کی حمایت حاصل نہیں۔اس سے ایک طرف تو وہ قادیانیوں کو اپنے قریب لانا چاہ رہے تھے دوسری طرف مجلس احرار کو کانگریس نوازی کے الزام سے بریت کا موقع فراہم کر رہے تھے۔اور تیسرے مسلمانوں میں سیاسی خلفشار کو فروغ دینے کی کوشش کر رہے تھے۔تاکہ وہ کسی ایک نصب العین اور کسی ایک سیاسی قیادت کے پرچم تلے جمع نہ ہو سکیں۔اسی لیے حضرت اقبال جیسے دور اندیش مفکر نے پنڈت نہرو کی چالوں کو سمجھ کر ان مضامین میں اٹھائے گئے تمام سوالوں کا مسکت جواب دیا۔علامہ اقبال کا مضمون "اسلام اور احمدیت" پورے متن کے اردو ترجمے کے ساتھ نعیم آسی کی کتاب "اقبال اور قادیانی" میں موجود ہے۔ بہت ساری دیگر کتب میں اسکے اقتباسات موجود ہیں۔طوالت سے بچنے کے لیے چند ایک حوالے پیش کیے جاتے ہیں۔

پنڈت جی کے مضامین کا ذکر کرتے ہوئے حضرت اقبال نے لکھا!

"میں اس واقعہ کو پنڈت جی اور قارئین سے پوشیدہ نہیں رکھنا چاہتا کہ پنڈت جی کے مضامین نے میرے ذہن میں احساسات کا ایک دردناک ہیجان پیدا کر دیا ہے۔ یہ جانتے ہوئے کہ پنڈت جی ایک ایسے انسان ہیں جو مختلف تہذیبوں سے وسیع ہمدردی رکھتے ہیں میرا ذہن اس خیال کی طرف مائل ہے کہ وہ جن سوالات کو سمجھنے کی خواہش رکھتے ہیں وہ بالکل خلوص پر مبنی ہیں تاہم جس طریقے سے انھوں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اس سے ایسی ذہنیت کا پتہ چلتا ہے جس کو پنڈت جی کی طرف منسوب کرنا میرے لیے دشوار ہے میں اس خیال کی طرف مائل ہوں کہ میں نے قادیانیت کے متعلق جو بیان دیا تھا اس سے پنڈت جی اور قادیانی دونوں پریشان ہیں۔ غالباً اسکی وجہ یہ ہے کہ مختلف وجوہ کی بنا پر دونوں اپنے دل میں مسلمانان ہند کے مذہبی اور سیاسی استحکام کو پسند نہیں کرتے۔ یہ ایک بدیہی بات ہے کہ ہندوستانی قوم پرست جنکے سیاسی تصورات نے احساس حقائق کو کچل ڈالا ہے اس بات کو گوارہ نہیں کرتے کہ شمال مغربی ہند کے مسلمانوں میں احساس خودمختاری پیدا ہو۔ میری رائے میں انکا خیال غلط ہے کہ ہندوستانی قومیت کے لیے ملک کی مختلف تہذیبوں کو مٹا دینا چاہیے۔ تا کہ ان ہندوستانی تہذیبوں کے باہمی عمل و اثر سے ہندوستان ایک ترقی پذیر اور پائیدار تہذیب کو نمو دے سکے۔ ان تہذیبوں سے جو تہذیب نمو پائے گی اسکا نتیجہ بجز باہمی تشدد اور تلخی کے اور کیا ہوگا؟ یہ بات بھی بدیہی ہے کہ قادیانی بھی مسلمانان ہند کی سیاسی بیداری سے گھبرائے ہوئے ہیں۔ کیونکہ وہ محسوس کرتے ہیں کہ مسلمانان ہند کے سیاسی نفوذ کی ترقی سے انکا مقصد یقیناً فوت ہو جائے گا۔ یعنی پیغمبر عرب ﷺ کی امت سے ہندوستانی پیغمبر کی ایک نئی امت تیار کریں۔ حیرت کی بات ہے کہ میری یہ کوشش کہ مسلمانان ہند کو اس امر سے متنبہ کروں کہ ہندوستان کی تاریخ میں جس دور سے وہ گزر رہے ہیں انکا اندرونی استحکام کس قدر ضروری ہے۔ اور انتشار انگیز قوتوں سے محترز رہنا کس قدر ناگزیر ہے۔ جو اسلامی تحریک کے بھیس میں پیش ہوتی ہیں اور پنڈت جی کو موقع دیتی ہیں کہ وہ ایسی تحریکوں سے ہمدردی کریں۔"

اسی مضمون میں علامہ اقبال نے ختم نبوت کے تصور اور اس سلسلے میں مرزا غلام احمد قادیانی اور اسکے پیروکاروں کی غلطی کی

نشاندہی کرتے ہوئے لکھا!

> ”ختم نبوت کے تصور کی ثقافتی قدر و قیمت کی توضیح میں نے کسی اور جگہ کر دی ہے۔ اسکے معنے بالکل سلیس ہیں۔ حضرت محمد ﷺ کے بعد جنھوں نے اپنے پیروکاروں کو ایسا قانون عطا کیا ہے جو ضمیر انسان کی گہرائیوں سے ظہور پذیر ہوتا ہے۔ ایسی آزادی کا رتبہ دکھایا ہے کہ کسی اور انسانی ہستی کے آگے روحانی حیثیت سے سر نیاز خم نہ کیا جائے۔ دینیاتی نقطہ نظر سے اس نظریے کو یوں بیان کر سکتے ہیں کہ وہ اجتماعی اور سیاسی تنظیم جسے اسلام کہتے ہیں مکمل اور ابدی ہے۔ حضرت محمد ﷺ کے بعد ایسے الہام کا امکان ہی نہیں ہے جس کا انکار کفر کو مستلزم ہو۔ جو شخص ایسے اسلام کا دعویٰ کرتا ہے وہ اسلام سے غداری کرتا ہے۔ قادیانیوں کا اعتقاد ہے کہ تحریک احمدیت کا بانی الہام کا حامل تھا۔ وہ تمام عالم اسلام کو کافر قرار دیتے ہیں۔ خود بانی احمدیت کا استدلال جو قرون وسطیٰ کے متکلمین کے لیے زیبا ہو سکتا ہے یہ ہے کہ اگر کوئی دوسرا نبی پیدا نہ ہو سکے تو پیغمبر اسلام کی روحانیت نامکمل رہ جائے گی۔ وہ اپنے دعوے کے ثبوت میں خود اپنی نبوت کو پیش کرتا ہے۔ لیکن آپ اس سے پھر دریافت کریں کہ حضرت محمد ﷺ کی روحانیت ایک سے زیادہ نبی پیدا کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے تو اس کا جواب نفی میں ہے۔ یہ خیال اس بات کے برابر ہے کہ حضرت محمد ﷺ آخری نبی نہیں ہیں میں آخری نبی ہوں۔ اس امر کو سمجھنے کی بجائے کہ ختم نبوت کا اسلامی تصور نوع انسانی کی تاریخ میں بالعموم اور ایشیا کی تاریخ میں بالخصوص کیا قدر رکھتا ہے۔ بانی احمدیت کا خیال ہے کہ ختم نبوت کا تصور ان معنوں میں کہ حضرت محمد ﷺ کا کوئی پیروکار نبوت کا درجہ حاصل نہیں کر سکتا خود حضرت محمد ﷺ کی نبوت کو نامکمل پیش کرتا ہے۔ جب میں بانی احمدیت کی نفسیات کا مطالعہ انکے اپنے دعویٰ نبوت کی روشنی میں کرتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے دعوے کے ثبوت میں پیغمبر اسلام ﷺ کی تخلیقی قوت کو صرف ایک ہی نبی یعنی تحریک احمدیت کے بانی تک محدود کر کے پیغمبر اسلام کے آخری نبی ہونے سے انکار کر دیتا ہے۔ اس طرح یہ نیا پیغمبر چپکے سے اپنے روحانی مورث کی ختم نبوت پر متصرف ہو جاتا ہے۔“

یقیناً علامہ اقبال نے قادیانیت کے خلاف یہ ایک ایسا سوال اٹھایا جس کا جواب وہ قیامت تک نہیں دے سکیں گے۔ اقبال نے

قادیانیوں کو بھی لاجواب کیا اور پنڈت نہرو کو بھی ہر سوال کا جواب دیا۔ مسلمانوں کی خیر خواہی میں پنڈت نہرو کے مشوروں کا جواب دیتے ہوئے انھوں نے لکھا!

> ''پنڈت نہرو مشورہ دیتے ہیں کہ تمام مذاہب کے راسخ العقیدہ لوگ متحد ہو جائیں اور اس چیز کی مزاحمت کریں جس کو وہ ہندوستانی قومیت سے تعبیر کرتے ہیں۔ یہ طنزآمیز مشورہ اس بات کو فرض کر لیتا ہے کہ احمدیت ایک اصلاحی تحریک ہے۔ وہ نہیں جانتے کہ جہاں تک ہندوستان میں اسلام کا تعلق ہے احمدیت میں اہم ترین مذہبی اور سیاسی امور تنقیح طلب مضمر ہیں۔ جیسا کہ میں نے اوپر تشریح کی ہے۔ مسلمانوں کے مذہبی تفکر کی تاریخ میں احمدیت کا وظیفہ ہندوستان کی موجودہ غلامی کی تائید میں الہامی بنیاد فراہم کرتا ہے۔ خالص مذہبی امور سے قطع نظر سیاسی امور کی بنا پر بھی پنڈت جواہر لال نہرو کے شایان شان نہیں کہ وہ مسلمانان ہند پر رجعت پسند اور قدامت پسند ہونے کا الزام لگائیں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اگر احمدیت کی اصل نوعیت کو سمجھ لیتے تو مسلمانان ہند کے اس رویہ کی ضرور تعریف و تحسین کرتے جو ایک مذہبی تحریک کے متعلق اختیار کیا گیا ہے جو ہندوستان کے تمام آفات و مصائب کے لیے الہامی سند پیش کرتی ہے۔''

علامہ اقبال نے پنڈت نہرو کی طرف سے اسماعیلیوں کی بابت اٹھائے گئے سوال کا جواب بھی دیا اور بہائیوں اور قادیانیوں کا موازنہ کر کے قادیانیوں کو بدتر قرار دیا۔ سر آغا خان کے متعلق انکا جواب ملاحظہ فرمائیں!

> ''ہز ہائینس آغا خان کے متعلق میں دو ایک لفظ کہنا چاہتا ہوں میرے لیے اس امر کو معلوم کرنا دشوار ہے کہ پنڈت نہرو نے آغا خان پر کیوں حملے کیے۔ شاید وہ خیال کرتے ہیں کہ قادیانی اور اسماعیلی ایک ہی زمرے میں آتے ہیں وہ اس بات سے بداعتنا بے خبر ہیں کہ اسماعیلیوں کی دینی تاویلات کتنی ہی غلط ہوں پھر بھی وہ اسلام کے بنیادی اصولوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ اسماعیلی تسلسل امامت کے قائل ہیں لیکن انکے نزدیک امام حامل وحی نہیں ہوتا۔ وہ محض قانون کا مفسر ہوتا ہے۔ کل ہی کی بات ہے کہ ہز ہائینس سر آغا خان نے اپنے پیروؤں کو حسب ذیل الفاظ میں خطاب فرمایا! ''گواہ رہو کہ اللہ ایک ہے اور محمد ﷺ اسکے رسول ہیں۔ قرآن اللہ کی کتاب ہے ، کعبہ سب کا قبلہ ہے۔ تم مسلمان ہو اور مسلمانوں کے ساتھ زندگی بسر کرو۔ مسلمانوں سے السلام علیکم کہہ کر ملو۔ اپنے بچوں کے

اسلامی نام رکھو۔ مسلمانوں کے ساتھ مسجد میں نماز پڑھو، پابندی سے روزے رکھو، اسلامی قانون نکاح کے مطابق اپنی شادیاں کرو۔ تمام مسلمانوں کے ساتھ بھائیوں کی طرح برتاؤ کرو۔"

بہائیوں اور قادیانیوں میں ایک مماثلت کا بھی ذکر حضرت اقبال نے ان الفاظ میں کرتے ہوئے قادیانیوں کے متعلق اپنی تشویش کا اظہار ان الفاظ میں کیا!

"ایران میں بھی اسی قسم کا ڈرامہ کھیلا گیا تھا لیکن اس میں وہ سیاسی امور پیدا ہوئے اور نہ ہو سکتے تھے جو احمدیت نے اسلام کے لیے ہندوستان میں پیدا کیے۔ روس نے بابی مذہب کو روا رکھا اور بابیوں کو اجازت دی کہ وہ اشک آباد میں اپنا پہلا مرکز قائم کریں۔ انگلستان نے بھی احمدیوں کے ساتھ رواداری برتی اور انکو اپنا پہلا تبلیغی مرکز ووکنگ میں قائم کرنے کی اجازت دی۔ ہمارے لیے اس امر کا فیصلہ کرنا کہ آیا روس اور انگلستان نے ایسی رواداری کا اظہار شہنشاہی مصلحتوں کی بنا پر کیا یا وسعت نظری کی وجہ سے۔ اس قدر تو واضح ہے کہ اس رواداری نے اسلام کے لیے پیچیدہ مسائل پیدا کر دیے ہیں۔ اسلام اس ہیئت ترکیبی کے لحاظ سے جیسا کہ میں نے اس کو سمجھا ہے مجھے یقین کامل ہے کہ اسلام ان دشواریوں سے جو اس کے لیے پیدا کی گئی ہیں زیادہ پاک صاف ہو کر نکلے گا۔ زمانہ بدل رہا ہے، ہندوستان کے حالات ایک نیا رخ اختیار کر چکے ہیں، جمہوریت کی ایک نئی روح جو ہندوستان میں پھیل رہی ہے وہ یقیناً احمدیوں کی آنکھیں کھول دے گی، انھیں یقین ہو جائے گا کہ انکی دینیاتی ایجادات بالکل فضول ہیں۔"

۱۲ جون ۱۹۳۶ء کو پنڈت نہرو کے نام اپنے ایک خط میں حضرت اقبال نے لکھا!

"میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ان مضامین کو لکھتے وقت ہندوستان اور اسلام کی بہتری میرے پیش نظر تھی اور میں اپنے ذہن میں اس امر کے متعلق کوئی شبہ نہیں پاتا کہ احمدی اسلام اور ہندوستان دونوں کے غدار ہیں۔"

اقبال اور قادیانیت کی مخاصمت کے عنوان کو میں یہیں پر چھوڑتا ہوں اگرچہ اقبال کے خلاف قادیانیوں کی انگریز نوزی اور ایام شباب کی رنگینیوں کے متعلق پھیلائے گئے بے سروپا الزامات کا بھی تحقیقی جواب دیا جا سکتا تھا مگر مضمون کی طوالت کے خوف سے صرف حضرت اقبال کے ان اشعار پہ اختتام کرتا ہوں۔

وہ نبوت ہے مسلماں کے لیے برگ حشیش　　　جس نبوت میں نہیں قوت وشوکت کا پیام

عصر من پیغمبرے ہم آفرید	آنکہ در قرآں خود راہم ندید
تن پرست وجاہ مست وکم نگاہ	اندرونش بے نصیب از لا الٰہ

☆☆☆☆　　☆☆☆☆　　☆☆☆☆